نیند شرط نہیں

خواجہ جاوید اختر

شب خون کتاب گھر، الہ آباد

Neend Shart Nahin (Poetry)

By : Khwaja Jawed Akhtar

نام کتاب : نیند شرط نہیں

شاعر : خواجہ جاوید اختر

سن اشاعت : ۲۰۱۰

تعداد : ۵۰۰

انتخاب وترتیب : ندیم احمد (شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی)

کمپوزنگ : جاوید نظر، کریلی، الٰہ آباد۔9335489474

سرورق : شاداب مسیح الزماں

طابع : پشپی آفسٹ، بائی کا باغ، الٰہ آباد

ناشر : شب خون کتاب گھر، الٰہ آباد

قیمت : ۲۰۰ روپئے

ملنے کا پتہ

۱۔ شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الٰہ آباد۔۲۱۱۰۰۳ یو. پی.

۲۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴

۳۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڈھ ۲۰۲۰۰۲

۴۔ مژگاں پبلیکیشنز، ۲۱ بی سی. علیم الدین اسٹریٹ، کولکاتا۔۱۶

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لئے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لئے

عرفان صدیقی

تعارف

شاعر کا نام : خواجہ جاوید اختر

والد کا نام : خواجہ شریف الحق (مرحوم)

والدہ کا نام : قیصرہ بانو (مرحومہ)

جائے پیدائش : کانکی نارہ، ۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال

تاریخ پیدائش : ۲؍ستمبر ۱۹۶۴

تعلیم : ایم.اے.(علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

پیشہ : ملازمت (اکاؤنٹنٹ جنرل آفس، اتر پردیش، الہ آباد)

پتہ : ڈی۔۱۲۹، جی.ٹی.بی نگر، کریلی، الہ آباد۔۲۱۱۰۱۶ یو.پی.

رابطہ : 09415365384

انتساب

اپنے ابّو

خواجہ شریف الحق (مرحوم)

اور امّی

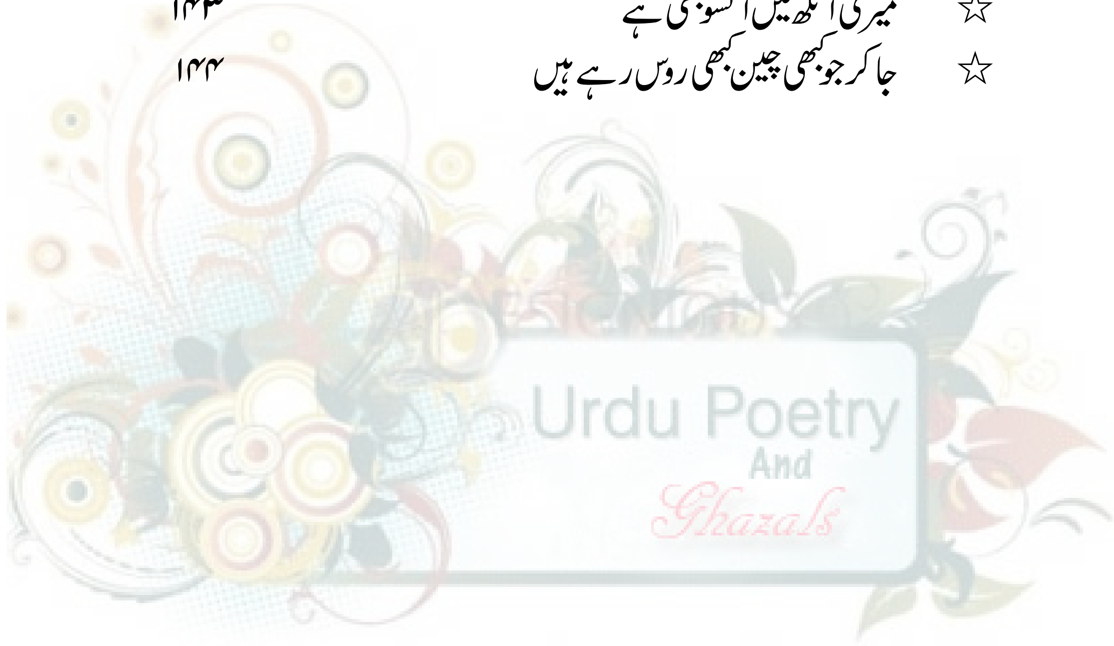
قیصرہ بانو (مرحومہ)

کے نام

جن کے زیرِ سایہ میری ذہنی تربیت پروان چڑھی۔

اب ان کی یادیں ہی میری زندگی کا اصل سرمایہ ہیں۔

فہرست


Urdu Poetry
And
Ghazals

خواجہ جاوید اختر کی غزل

خواجہ جاوید اختر کچھ مدت سے ہمارے افق شعر پر نمایاں ہیں۔ ''نیند شرط نہیں'' ان کا پہلا مجموعہ ہے۔ شروع شروع میں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی شاعری سہل ممتنع اور عام بول چال کے لہجے کی تلاش میں کچھ اس درجہ منہمک ہے کہ مضمون کی تلاش کو پس پشت ڈالنے سے بھی گریز نہ کرے گی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، شاعری کی بنیاد موضوع پر نہیں۔ کوئی بھی موضوع شاعری میں چل سکتا ہے۔ شاعری کی بنیاد مضمون ہے، اور مضمون کی بنیاد استعارے پر ہے۔ استعارہ ہمیں دنیا کو نئے نئے انداز سے دکھاتا ہے اور زندگی کی نئی نئی تعبیرات تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ کچھ لوگ استعارے کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خود زبان کی بنیاد استعارہ ہے۔ پھر ایسی صورت میں استعارے پر زور دے کر شاعری کو پیچیدہ اور بوجھل کیوں بنایا جائے؟ لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ زبان کی استعاراتی نوعیت زبان کی گہرائیوں میں کہیں اتنی دور پیوست ہے کہ وہ عام طور پر نظر اور خیال سے اوجھل رہتی ہے۔ اس لئے شاعری کی زبان کو اظہار ذات اور انکشاف حیات کے لائق بنانے کے لئے زبان کی اوپری سطح پر بھی استعارے کا سہارا لینا اشد ضروری ہے۔

برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے لکھا ہے کہ ایک مدت تک میرا خیال تھا کہ ہر لفظ کی اصل معنوی کیفیت کسی نہ کسی خیالی یا عینی (Ideal) دنیا میں ضرور ہوگی، ورنہ لفظوں میں معنی کہاں سے آتے؟ لیکن مزید استفسار اور غور وفکر کے بعد بھی میں یہ نہ سمجھ سکا کہ Why, Notwithstanding, Whence وغیرہ الفاظ کے معنی تو میری مفروضہ عینی دنیا میں کچھ ہو ہی نہیں سکتے، کیونکہ یہ الفاظ کسی شے کا اظہار نہیں کرتے۔

حاصل کلام یہ کہ زبان کی اصل چاہے استعاراتی مانی جائے، چاہے افلاطونی عینیت کے سہارے کسی عینی دنیا میں تمام لفظوں کی اصل کو موجود فرض کیا جائے، لیکن زبان کو شاعری میں برتنا ہو تو اسے مزید استعاراتی بنانا ضروری ہوتا ہے۔ سہل ممتنع کی کیفیت میں عام طور پر صاف بیانی، براہ راست گفتگو، اور کبھی کبھی طنز کو استعارے کا قائم مقام سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کل بہت سے شعرا واقعات کے سپاٹ بیان کو سہل ممتنع سمجھ کر طنز، یا قول محال، یا تضاد جیسی ترکیبوں کو بھی نہیں برتتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کلام موزوں ہو اور اس میں ذرا سی برجستگی ہو، تو شعر کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا طرح کے شعر، یعنی موزوں اور برجستہ شعر، اسی طرز کے شعر ہیں جنھیں میں نے ''غیر

شعر'' کا نام دیا تھا۔ ہوسکتا ہے ایسے شعر بھی کچھ لطف دے جائیں، اور اپنی برجستگی کے باعث ایک حد تک، اور کچھ دیر کے لئے، مقبول بھی ہو جائیں۔ لیکن شاعری کا حق وہ ادا نہیں کر سکتے۔ شاعری جب تک آپ کو تجربے کا کوئی نیا پہلو نہ دکھائے، معنی کا کوئی مزید امکان پیدا نہ کرے تب تک اسے تفریح کا ذریعہ تو شاید قرار دے سکتے ہیں، لیکن ہر تفریح کی طرح یہ تفریح بھی وقتی ہی ثابت ہوگی۔

خواجہ جاوید اختر کے شعر کا لہجہ عام گفتگو پر مبنی ہے۔ ایسا شعر بہت کچھ کر دکھاتا ہے اگر تک بندی کی طرف نہ جھک جائے۔ عام بول چال پر مبنی اور سہل ممتنع کے انداز کا شعر زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر طنز، یا قول محال، یا تضاد کے ذریعہ روشنی ڈالے تو ہم شاعر کے شکر گذار ہوتے ہیں، ورنہ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن خواجہ جاوید اختر کی خوبی اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ وہ باتوں باتوں میں چبھتی ہوئی بات کہہ جاتے ہیں جو عقل مندی سے بھرپور ہوتی ہے، کم عمری کے باوجود ان کی انداز گفتگو میں تجربہ کار بوڑھوں جیسی کیفیت ہے۔ ان کا متکلم ایسا شخص ہے جو زمانے کے سرد و گرم خوردہ ہے۔ اسے کسی چیز کی غرض نہیں، کسی چیز سے غرض نہیں۔ وہ ایک انداز بے پروائی کے ساتھ دنیا اور دنیا والوں پر رائے زنی کے پردے میں اپنے فیصلے سنا جاتا ہے۔ وہ دنیا کے بگڑتے ہوئے حالات پر ہراساں نہیں ہے، شاید اس لئے کہ وہ سوچتا ہے اب مجھے بھلا کے دن اور جینا ہے جو میں ان جھمیلوں بکھیڑوں میں اپنا دل لگاؤں۔ میرا تو یہی منصب بہت ہے کہ میں اپنی بات بے دھڑک کہہ جاؤں ؂

ہاں کہہ کے اپنی جان بچانے لگے ہیں لوگ
یعنی کہ اب زمانہ نہیں کا نہیں رہا

وصال یار سے اچھا تو ہجر ہی ہے کہ اب
سکوں سے رہتے ہیں وہ بھی اور اپنی شان سے ہم

دوسرے شعر کو مندرجہ ذیل کے ساتھ پڑھئے تو ''شان'' کے معنی زیادہ سمجھ میں آتے ہیں۔ لہجے کی خشکی قابلِ داد ہے ؂

جھوٹ پر جھوٹ بولے جاتے ہو
کچھ کمی رہ گئی ہے شان میں کیا

کوئی سو رہا ہے اجالے میں دن کے
کوئی رات کے خوف سے جاگتا ہے

یہاں تضاد امیری غریبی، یا ضعیفی جوانی کا نہیں۔ یہاں تضاد زیادہ باریک اور زیادہ لطیف ہے۔ یہ تضاد ذہنی کیفیتوں کا بھی ہے، اور زندگی گذارنے میں ناکامی کے مدارج کا بھی۔ یعنی دن بنایا گیا تھا کام کرنے کے لئے اور رات، آرام کرنے کے لئے۔ بہت سے لوگوں کو روشنی میں نیند بھی نہیں آتی۔ بہت سے لوگوں کے لئے رات تخلیقی اور تفکیری کاموں کے لئے وقت فراہم کرتی ہے۔ لیکن جنھیں رات کے خوف سے نیند نہ آئے وہ وظیفۂ حیات کا پہلا سبق بھی نہیں سیکھ سکے ہیں۔ جاوید اختر کے یہاں کام کرنے والے لوگ، باہر کے لوگ، بازاروں اور دفتروں میں آنے جانے والے لوگ شاعری کے لئے موضوع فراہم کرتے ہیں۔ اور شاعران موضوعات کو ایک عجب تلخ مزاج، دل جلے، یا زندگی سے اکتائے ہوئے شخص کی طرح برتتا ہے۔

بیکار کے کاموں میں ابھی الجھے ہیں ہم لوگ
فرصت جو ملے گی تو کوئی کام کریں گے

وہ اپنی حرکتوں سے باز آیا ہے نہ آئے گا
اسے ہم کنکری ماریں گے اور شیطان کر دیں گے

پہلے سوتی تھی چین سے دنیا
اب کوئی بے خبر نہیں سوتا
پہلے آتی نہیں تھی نیند مجھے
اب مرا چارہ گر نہیں سوتا

چل کے ذرا دیکھیں تو کیا ہے
آخر اس منظر کے پیچھے

دن ہے کہ سمٹتا ہے ضرورت سے زیادہ
پھیلی ہے مگر دور تلک رات ہماری

ہاں یہ سورج حیات بخش سہی
دھوپ کھا کر گذر نہیں ہوتا

ہمارے دشت میں آواز دو آہو نکلتا ہے
تمھارے شہر میں ہر بات پر چاقو نکلتا ہے

کوئی بھی راستہ اس کا مرے گھر تک نہیں آتا
مجھے معلوم ہے وہ شہر میں ہر سو نکلتا ہے

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، خواجہ جاوید اختر کی شاعری کا انداز سہل ممتنع اور عام بول چال کا سا ہے۔اس انداز کومزید تقویت اس بات سے ہوتی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر شعر چھوٹی بحروں میں کہے ہیں۔اور چھوٹی بحروں میں بھی انھوں نے وہی بحریں اختیار کی ہیں جو یا تو بحر میؔر سے مستخرج ہیں، یا پھر بحر متقارب یا بحر متدارک یا بحر خفیف پر مبنی ہیں۔فارسی تراکیب کا بھی استعمال بہت کم ہے، اور جہاں ہے بھی تو وہاں کچھ بہت زیادہ چمک دمک کے ساتھ نہیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر محبوب خزاں اور انور شعور سے ان کا موازنہ فطری معلوم ہوتا ہے لیکن یہ مماثلت ہمیں بہت دور تک نہیں لے جاتی۔

محبوب خزاں کی غزل کا متکلم ہمارے سامنے ایک ایسے شخص کے روپ میں آتا ہے جسے عشق کا تجربہ ہے، اور اس کا عشق ناکام رہا ہے، یا پھر اس نے عشق کو اندر ہی اندر سہ لیا اور اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔محبوب خزاں کا متکلم جہاں دیدہ اور بڑی حد تک خود بیں بھی ہے، وہ خود کو، اور دوسرے شعرا کو رائے مشورہ بھی دیتا چلتا ہے۔انور شعور زبان کو جان بوجھ کر تقلیل بیان یعنی Understatement کے لئے استعمال کرتے ہیں۔یعنی جو وہ کہنا چاہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں، اس سے بھی کم کہہ کر کام چلا لیتے ہیں۔خواجہ جاوید اختر کے یہاں ابھی زبان کی وہ صفائی اور قدرت نہیں ہے جو ان کے مذکورہ بالا پیش رووٗں کو ان کے معاصروں میں ممتاز کرتی ہے۔ان کے برخلاف، جاوید اختر کا متکلم، صرف دل جلا نہیں، برہم بھی ہے۔وہ بات کو کم کر کے نہیں کہنا چاہتا۔وہ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لئے ڈرامائی لہجہ اختیار کرتا ہے۔خواجہ جاوید اختر زندگی سے خفا نہیں ہیں، لیکن زمانے سے خفا ہیں جس کی ریاکاریوں کے طفیل ادھورے اور عیب دار انسان پیدا ہوتے ہیں۔ان کی برہمی انھیں طنز نگار نہیں بناتی، بازار کے ریلے میں بہتے ہوئے تماشائی کی طرح خود کلامی پر مجبور کرتی ہے۔

زمین پاؤں کے نیچے رہے تو کیسے رہے
وہ اپنی جیب میں جب آسمان بھرتا ہے

بڑے شہروں میں دیکھا ہے زیادہ تر نہیں ملتا
مکاں تو خوب ملتے ہیں مگر اک گھر نہیں ملتا

ایک میں ہی زمیں کی صورت ہوں
اور باقی تو آسماں ہیں سب
مدت سے اک عزم لئے
ہم راہ میں منزل ہیں

تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے
کیسے کوئی سرکے پیچھے

ہم کچھوے کی چال چلیں
تم ہی بنے خرگوش رہو

برسوں سے یہ کاٹ رہے ہیں
کھٹیا پیٹو کھٹمل مارو

خواجہ جاوید اختر کی غزل میں عشق کی بات چیت بہت کم ہے۔ عام طور پر خیال یہی ہوتا ہے کہ جس شخص کی شاعری روزمرہ کی گفتگو سے بہت قریب کا لہجہ رکھتی ہوگی، اس کے یہاں عشق کا چرچا بہت ہوگا، اور شاید عام سے زیادہ ہو ہی گا۔ کیونکہ عام زندگی میں تو عشق کے مختلف مشغلے، مختلف روپ، مختلف انداز خوب نظر آتے ہیں۔ لیکن خواجہ جاوید اختر کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کی وجہ شاید وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی، کہ ان کا متکلم ایک دل جلے اور آشفتہ مزاج شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس نے عشق کی بازی شاید کھیلی تھی، لیکن بہت جلد فریب شکستگی نے اسے آ لیا۔ اور اب اسے عشق سے دلچسپی تو ہے، لیکن اب عشق کی میٹھی میٹھی باتیں شاید اسے خوف زدہ کر دیتی ہیں۔ ایک شعر ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔

وصالِ یار سے اچھا تو ہجر ہی ہے کہ اب
سکوں سے رہتے ہیں وہ بھی اور اپنی شان سے ہم

اب چند اور شعر دیکھئے جن میں عشق کے بارے میں متکلم بہت کچھ شک، یا کبھی کبھی فریب شکستگی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

یہ کیسے کہہ دوں کہ پہچانتا بھی ہوں اس کو
وہ جس کو ایک زمانے سے جانتا ہوں میں

خواب میں بھی نہیں دیکھا کبھی چہرہ اس کا
دل کے آئینے میں سنتے ہیں پری رہتی ہے

اگر تیرے دم سے ہے آباد کوئی
تو برباد میں بھی ہوں چکر میں پڑ کے

آج کے زمانے کی عام لفظیات سے پرہیز بھی خواجہ جاوید اختر کی غزل کا ایک نمایاں وصف ہے۔ آج کے شعرا اور آج کے افسانہ نگار دونوں ہی شاید یہ سمجھ کر بیٹھے ہیں کہ صبح کے اخبار اور رات کی ٹی وی کی خبر کو سیدھی سادہ زبان میں تھوڑے بہت کلی پھندنے لگا کر دستر خوان سجا لینا کافی ہے، بلکہ بہت ہے۔ خواجہ جاوید اختر سکۂ رائج الوقت جیسے مضامین اور لفظوں سے عموماً پرہیز کرتے ہیں، یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کے یہاں اظہار ہمیشہ نوک پلک سے درست اور تخیل کی روشنی سے مالا مال رہتا ہے۔ سپاٹ شعر ان کے یہاں بھی ہیں، جانے بوجھے معاملات کو منظوم کر دینے کا لالچ انھیں بھی رہتا ہے، لیکن کم، بہت کم۔ میں امید کر سکتا ہوں کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ ان کے یہاں اور بھی خود مختارانہ پختگی آئے گی۔ اس وقت یہ مجموعہ بیشک خوش گوار اور دلکش مجموعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الہٰ آباد، اگست ۲۰۰۹

عرض حال

میرا تعلق مغربی بنگال کے ایک چھوٹے سے صنعتی شہر کانکی نارہ سے ہے، جو کلکتہ کے مضافات میں واقع ہے۔ گو کہ یہ شہر جغرافیائی اعتبار سے زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن یہاں کے تعلیمی ماحول اور درس و تدریس سے دلچسپی کی وجہ سے کئی ایسی شخصیتیں منظر عام پر آئیں کہ اسے ہندوستان کے نقشے میں بڑا بنا دیا۔ میری والدہ کو بچوں کو پڑھانے میں بہت دلچسپی تھی، پاس پڑوس کے بچے پابندی سے دینی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ چونکہ میرے نانا مولوی تھے اور یہ سب کچھ میری والدہ کو اپنے گھر سے ملا تھا، یہی سبب ہے کہ گھر کا ماحول بھی دینی رہا۔ میں نے بھی اپنی والدہ سے قرآن پاک پڑھا۔ انھوں نے مجھے کئی سورتیں اور دعائیں یاد کرائیں۔ علامہ اقبال کے اشعار یاد کرائے۔ مجھے بچپن سے شعر سننے کا شوق تھا، سینکڑوں اشعار از بر کئے۔ میرے بڑے ماموں خواجہ مجیب الحق فلاسفی کے پروفیسر تھے جو علامہ اقبال اور حالی کے بڑے مداح تھے۔ کالج سے لوٹنے کے بعد وہ ہم سب بھائی بہنوں کو مسدس حالی پڑھایا کرتے تھے۔ چھوٹے ماموں خواجہ وحید الحق کلکتہ یونیورسٹی سے ایم.اے. (اردو) میں گولڈ میڈلسٹ تھے، جو انٹر میڈیٹ تک میرے استاد بھی رہے، بعد میں کلکتہ یونیورسٹی کے بھوانی پور کالج میں لکچرر ہوئے۔ جنھوں نے وحید عرشی کے نام سے شاعری کی، ان کا شعری مجموعہ 'یادوں کا زنداں' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے اور جن کا کلام 'شب خون' میں بھی شائع ہوتا رہا۔ میں نے اردو میڈیم سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اردو سے مجھے بے انتہا لگاؤ رہا۔ حالانکہ میں نے انٹر کا امتحان سائنس سے پاس کیا اور کلکتہ یونیورسٹی کے ایک کالج میں بی.ایس.سی میں داخلہ بھی لیا، لیکن امتحان کی بروقت تیاری نہ کرنے کے باعث اس کے فائنل امتحان میں نہ بیٹھ سکا، جس کی وجہ سے گھر کے لوگ ناراض ہو گئے۔ اس وقت میرے دل و دماغ پر فٹ بال کا کھیل سوار تھا۔ چونکہ مغربی بنگال میں بالخصوص کلکتہ میں فٹ بال کا بڑا کریز رہا ہے اور اس زمانے

میں تو کلکتہ کے فٹ بال میدان تماش بینوں سے کھچا کھچ بھرے رہتے تھے۔ مجھے بھی اس کھیل سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ میں نے اس کھیل میں اپنی خوب مہارت دکھائی۔ نتیجتاً میرا شمار بھی ضلع کے اہم کھلاڑیوں میں کیا جانے لگا۔ میں نے کلکتہ فٹ بال لیگ کے میچ بھی کھیلے۔ ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں نارتھ زون انٹر یونیورسٹی فٹ بال ٹورنامنٹ ہونے والا تھا، مجھے یونیورسٹی کی طرف سے ٹیم میں شامل ہونے کا آفر ملا۔ علی گڑھ دور ہونے کی وجہ سے میرے والدین گھبرائے ہوئے تھے، لیکن میرے بڑے بھائی جناب خواجہ احمد حسین نے والدین کو سمجھایا اور وہاں Games کوٹے سے بی.اے.(آنرز) اردو میں میرا داخلہ کرا دیا گیا۔ علی گڑھ تک پہنچنے میں میرے بڑے بھائی جناب خواجہ احمد حسین نے جو رول ادا کیا وہ تو ناقابل فراموش ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی بھی کی۔ وہ خود ایک ہائی اسکول میں سائنس کے ٹیچر ہیں اور مغربی بنگال کے سیاسی رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اردو زبان کے شیدا ہیں اس لئے ان کو مغربی بنگال اردو اکادمی کا ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ انھوں نے بڑے بھائی ہونے کا جو فریضہ انجام دیا ہے وہ قرض زندگی بھر نہیں چکا سکتا۔ بات علی گڑھ کی ہو رہی تھی، جہاں کا ماحول بنگال کے ماحول سے قطعی مختلف تھا۔ اسلامی تہذیب، اسلامی رکھ رکھاؤ، اردو زبان کی شیرینیت، اس کا لب و لہجہ، اس کا رنگ و آہنگ، تعلیم کی اہمیت و قیمت، تعلیمی نظام کی پختگی، استادوں کی قدر و منزلت یہ سب کچھ یہاں آکر مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں پوری دلچسپی سے کلاسز کرنے لگا خاص طور سے اردو کے کلاس۔ اس وقت شعبۂ اردو میں ایسے ایسے جید اساتذہ موجود تھے جن کی دنیائے ادب میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ یوں تو یہ شعبہ شروع سے ہی ادبی اکابرین کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے، لیکن میرے لئے تو یہ سب کچھ نیا نیا سا تھا۔ جن اساتذہ سے مجھے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسر آئے ان میں پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر نورالحسن نقوی، پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر شہریار، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر قاضی افضال حسین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مجھے شعر گوئی کا شوق یہیں پیدا ہوا اور میں مصرعے موزوں کرنے لگا۔ شعر کہتا اور دوستوں کو سناتا۔ واہ واہ ہوتی، حوصلہ بڑھتا اور اپنے پر فخر کرتا کہ میں بھی شعر کہہ سکتا ہوں۔ ادب سے بھرپور دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے شعبۂ اردو میں طلبا کے لئے انجمن اردوئے معلی قائم کی گئی تھی۔ ایسے طلبا جنھیں کہانیاں لکھنے یا شاعری کرنے کا

ذوق وشوق تھا انھیں اس انجمن کی ماہانہ نشست میں شرکت کرنے اور ان کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس نشست میں شعبۂ اردو کے تمامی اساتذہ موجود ہوتے تھے اور طلبا کی تخلیقات پر کھل کر اظہار خیال کرتے تھے۔ ہر تخلیق پر بحث وتمحیص ہوتی، رطب ویابس بیان کئے جاتے، ردوقدح چلتی۔ اس طرح ذہنی آبیاری اور ذہنی پختگی کے راستے ہموار ہوتے رہے۔ میں ان اساتذہ کی علمی لیاقت اور ادبی شان بان سے خوف زدہ تھا، لیکن جب مجھے اس نشست میں پڑھنے کا موقع ملا تو میں نے بڑی ہمت اور اعتماد کے ساتھ اپنی ایک غزل ترنم سے پڑھی جس پر کافی داد ملی۔ میری شاعری کو سراہا گیا اور حوصلہ بڑھایا گیا۔ اس طرح میری جھجھک دور ہوئی، میں باضابطہ دل لگا کر شعر کہنے لگا۔ زبان وبیان کے اعتبار سے غزلوں میں درآنے والی خامیاں دور کرانے اور اشعار کی نوک پلک درست کرانے کی غرض سے میں علی گڈھ کے بزرگ شاعر جناب میکش بدایونی سے مشورے لینے لگا۔ وہ سنجیدہ طبع شاعر تھے، انھوں نے میری پذیرائی کی۔ مجھے ۱۹۸۶ء میں جب پروفیسر قاضی عبدالستار صدر شعبۂ اردو تھے، شعبے کی جانب سے منعقد ہونے والے یوم جمہوریہ کے مشاعرے میں طلبا کی نمائندگی کرنے کا موقع ملا۔ پہلی بار مشاعرے میں مجروح سلطانپوری اور اختر سعید خاں جیسے مہمان شعراء کی موجودگی میں غزل سنانے کا موقع ملا تو جیسے میری باچھیں کھل گئیں۔ پروفیسر منظر عباس نقوی نے مشاعرے کی نظامت کی۔ مشاعرے کا آغاز مجھ سے ہوا اور میں نے اپنی غزل ترنم سے پڑھی، جس پر خوب داد ملی۔ میرے اساتذہ وسینیئرز نے میری بے پایاں حوصلہ افزائی کی۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی مجھے رسالوں میں چھپنے چھپانے کا شوق رہا۔ میری غزلیں چھوٹے بڑے رسالوں میں شائع ہونے لگیں۔ اس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی توجہ میری طرف کچھ زیادہ منعطف ہونے لگی۔ ہال سے نکلنے والی میگزین کے علاوہ میری غزلیں علی گڈھ میگزین میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ میرا تعلیمی سلسلہ بھی عروج پر تھا۔ میں نے بی.اے. (آنرز) اور ایم.اے. (اردو) فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔

میرے طالب علمی کے زمانے میں بھی جدیدیت کا بڑا شور وغلغلہ تھا۔ علی گڈھ میں ’شب خون‘ پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ میرا بھی ذہنی جھکاؤ جدیدیت کی طرف تھا اور میں اس رجحان

سے کافی متاثر تھا۔شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا ذکر اکثر و بیشتر ادبی محفلوں میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے اپنے سینیئرز میں اسعد بدایونی، شہپر رسول، آشفتہ چنگیزی، قمرالہدیٰ فریدی، صغیرافراہیم، محمد علی جوہر وغیرہ کی صحبتوں میں بیٹھنے کے مواقع ہاتھ آتے رہے۔ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے فخر محسوس ہوتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے نئے ادب، نئی شاعری کی پہچان بنی اور اردو شاعری کی نئی نسل کو ان ناموں سے وقار ملا۔ شاعری میں جمود کا رونا رونے والوں کے لئے یہ نام تازیانے کا کام کرنے لگے۔ اسعد بدایونی تو بہت کم عمر پا کر ہی اس دنیا سے چل بسے لیکن ان کا کلام زندہ و تابندہ ہے۔ یونیورسٹی میں میری شہرت اس لئے بھی تھی کہ میں یونیورسٹی فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی تھا اور ۱۹۸۷ء میں مجھے یونیورسٹی فٹ بال ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا تھا۔میری کیپٹن شپ کی قیادت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک ریکارڈ قائم کیا تھا۔اسی سال علی گڑھ یونیورسٹی نے آل انڈیا انٹر یونیورسٹی فٹ بال ٹورنامنٹ میں Unbeaten چمپئن شپ کا خطاب حاصل کیا۔یونیورسٹی میں جوش و مسرت کا وہ عالم تھا کہ وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب نے خوشی کے اظہار کے طور پر یونیورسٹی میں ایک دن کی چھٹی کر دی۔اس موقع پر میری جس قدر دل جوئی اور پذیرائی ہوئی اسے تا حیات نہیں بھول سکتا۔

۱۹۸۹ء میں ایم.اے.کرنے کے ٹھیک تین مہینے بعد مجھے اکاؤنٹنٹ جنرل آفس اتر پردیش، الٰہ آباد میں ملازمت مل گئی، جسے لوگ اے.جی.آفس کے نام سے جانتے ہیں الٰہ آباد آنے کے بعد جب کسی کے ذریعہ سیمینار، نشست یا مشاعرے کی خبر ملتی تو میں بحیثیت سامع جایا کرتا اور پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ کر لطف اندوز ہوتا اور چلا آتا کیونکہ اس زمانے میں میرا کسی سے تعارف نہیں تھا۔ایک بار میرے آفس کے زیر اہتمام 'ہندی ہفتہ' کے موقع پر کوی سمّیلن اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں میں نے بھی اپنی غزل پڑھی۔اس موقع پر میرے دفتر کے ہی ایک سنجیدہ شاعر اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے برادر نسبتی جناب فرخ جعفری بھی موجود تھے، انھوں نے مجھے 'ادارۂ فن و ادب' میں شرکت کی دعوت دی اور وہاں کی نشست کے قواعد و ضوابط بتائے۔اس ادارے کی بنیاد بزرگ شاعر ڈاکٹر سہیل احمد زیدی نے رکھی تھی۔وہ اصولوں کے بڑے سخت تھے اور اس کی پابندی شاعروں سے بھی کرواتے تھے۔ مجھے اس ادارے کی نشستوں میں تواتر کے ساتھ شریک ہونے کے مواقع ملے۔اس طرح نئی نئی غزلیں

کہنے کی تحریک ملتی رہی۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے ملاقات اسی ادارے کی نشست کے موقع پر ہوئی کیونکہ کبھی کبھی اس ادارے کی نشست ان کے دولت کدے پر بھی ہوتی تھی۔ ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور میں کبھی کبھار سلام عرض کرنے اور خیریت دریافت کرنے ان کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ کیونکہ میرے آفس سے ان کا مکان مختصر فاصلے پر ہے۔ فاروقی صاحب کی شفقت مجھے ملنے لگی اور وہ مجھے ادب کی باریکیوں کی بابت بتاتے رہے۔ ایسے قدیم و جدید شعرا کے نام بتائے جنھیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا۔ خالص ادب پڑھنے کا شوق ان کی ہی دین ہے۔ 'شب خون' میں اشاعت کے لئے میں نے فاروقی صاحب کو اپنی غزلیں دیں جن میں ایک غزل ان کو پسند آئی اور اسے کچھ ترمیم کے ساتھ 'شب خون' کے شمارہ نمبر ۲۰۳ میں پہلی بار شائع کیا۔ اسی سال فاروقی صاحب کو برلا فاؤنڈیشن نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 'سرسوتی سمان' سے نوازا تھا۔ اس موقع پر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی میں ایک تہنیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں علی گڈھ سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ 'شب خون' میں چھپنا میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی اور مسرت کا مقام بھی۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے 'شب خون' میں میری غزل دیکھ کر کہا کہ اب تمہاری شاعری کو Recognition ملا ہے۔ فاروقی صاحب کی شفقتیں مجھے ملتی رہیں، میں 'شب خون' میں تواتر کے ساتھ چھپتا رہا۔ حتیٰ کہ انھوں نے شب خون کے ۴۰ سالہ انتخاب میں بھی میری غزل کو شامل کیا۔ اردو کے اس عظیم نقاد، شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مترجم اور ماہر لسانیات کا میں احسان مند ہوں کہ جن کی بدولت ادب میں میری تھوڑی بہت پہچان بنی۔ ان کی علمی فضیلت سے متاثر ہو کر میں نے اپنی غزل میں ایک شعر کہا ہے ؎

فاروقی کو دیکھو تو
علم کا ایک سمندر ہے

میرے اس شعری مجموعے پر فاروقی صاحب نے پیش لفظ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، جسے انھوں نے اپنی طبیعت کی خرابی، اپنے ذاتی تخلیقی کاموں کی مصروفیات کے باوجود پورا کیا، اس کے لئے میں بہ صمیم قلب ان کا ممنون ہوں۔ میں بالخصوص جاوید نظر اور امین اختر کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت میں اپنی دلچسپی دکھائی اور بھرپور تعاون کیا۔ میں اپنی شریک حیات شبنم رحمان کا بھی

مشکور ہوں جن کی توجہ کے بغیر میرے شعری مجموعے کی اشاعت ناممکن تھی۔

اپنا شعری مجموعہ 'نیند شرط نہیں' اپنے قارئین کی خدمت میں اس توقع کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ شاعری تو سفر مدام سفر ہے اور میں اس سفر میں کہاں تک کامیاب ہو سکا، اس کا فیصلہ وہی کریں گے۔

خواجہ جاوید اختر




غزلیں
Urdu Poetry
And
Ghazals



چاہت میں آسماں کی زمیں کا نہیں رہا
کیا بدنصیب تھا وہ کہیں کا نہیں رہا

دنیا کے انہماک میں دیں کا نہیں رہا
گھر اس کا جس جگہ تھا وہیں کا نہیں رہا

یہ اور بات ہے کہ ہمیں اعتبار ہو
ورنہ زمانہ آج یقیں کا نہیں رہا

ہاں کہہ کے اپنی جان بچانے لگے ہیں لوگ
یعنی کہ اب زمانہ نہیں کا نہیں رہا

پیشانیوں پہ نقش تو سجدے کا بن گیا
لیکن کہیں نشان جبیں کا نہیں رہا

جاوید اپنے فکر و نظر آسماں سے لا
پیارے زمانہ خاک نشیں کا نہیں رہا



غرض اس سے نہیں مجھ سے محبت کون کرتا ہے
اسے تو دیکھنا یہ ہے کہ نفرت کون کرتا ہے

محبت کون کرتا ہے عداوت کون کرتا ہے
ذرا دیکھیں گے ہم بھی یہ جسارت کون کرتا ہے

وہ دشمن ہی سہی لیکن نمک پاشی تو کرتے تھے
مگر اب یہ عنایت یہ مروت کون کرتا ہے

بظاہر تم اسے شاہِ جہاں کہتے ہو اے لوگو
کبھی سوچا پسِ پردہ حکومت کون کرتا ہے

من و سلویٰ جہاں گھر بیٹھ کر ملتا ہو لوگوں کو
تو پھر طے ہفت خوانوں کی مسافت کون کرتا ہے



نکل تو آئے اس اجڑے ہوئے مکان سے ہم
تمام شب رہے محروم سائبان سے ہم

ہم اپنے وقت کے بالا بلند سورج تھے
غروب ہو گئے کس طرح درمیان سے ہم

ذرا بھی جس میں نصیحت ہو کچھ ہدایت ہو
نکال دیتے ہیں وہ بات اپنے کان سے ہم

دل و دماغ نہیں لفظ ہی کرشمہ ہے
تو کیا عجب کہ ہوئے قتل اس زبان سے ہم

وصال یار سے اچھا تو ہجر ہی ہے کہ اب
سکوں سے رہتے ہیں وہ بھی اور اپنی شان سے ہم

یہ سر بلند تو ہو جائے گا مگر جاوید
ضرور جائیں گے اک روز اپنی جان سے ہم



روز ازل سے ہے یہ برائی لگی ہوئی
کھلتے کنول کے ساتھ ہے کائی لگی ہوئی

سائے میں چھت کے بیٹھ گیا ہوں یہ سوچ کر
اک عمر کی ہے اس میں کمائی لگی ہوئی

اک دن یہی فصیل بڑے کام آئے گی
دیکھی ہے جس پہ آپ نے کائی لگی ہوئی

یہ سوچ کر وصال بھی غمگین کر گیا
ہر اتّصال سے ہے جدائی لگی ہوئی

جس وقت آسمان کو چھونے چلا تھا میں
پیچھے تھی میرے ایک خدائی لگی ہوئی



سمجھ سکا نہ کوئی آج تک کہ کیا ہوں میں
ہوا کے دوش پہ جلتا ہوا دیا ہوں میں

وجود ہو گا مجسم مرا کبھی نہ کبھی
ابھی تو تیری فضا میں بکھر رہا ہوں میں

یہ کیسے کہہ دوں کہ پہچانتا بھی ہوں اس کو
وہ جس کو ایک زمانے سے جانتا ہوں میں

دعا قبول ہوئی اضطراب باقی ہے
یہی بہت ہے کہ کچھ کامیاب سا ہوں میں

نہ جانے کب میں کنارے پہ جا لگوں جاوید
سوار ناؤ پہ ہوں اور ڈوبتا ہوں میں



دل کی دنیا ہے مصیبت سے بھری رہتی ہے
پھر بھی ہر شاخ تمنا کی ہری رہتی ہے

جانے کب آ کے وہ دروازے پہ دستک دے دے
زندگی موت کی آہٹ سے ڈری رہتی ہے

خواب میں بھی نہیں دیکھا کبھی چہرہ اس کا
دل کے آئینے میں سنتے ہیں پری رہتی ہے

میں سکندر ہوں نہ صوفی نہ قلندر یارو
پھر بھی روشن مری آشفتہ سری رہتی ہے

ایک ہی پل میں پلٹتی ہے لکیروں جیسی
جیسے ہر سانس ہتھیلی پہ دھری رہتی ہے



جو بھی محفل میں دوبارہ جائے گا
دیکھنا بے موت مارا جائے گا

سن رہا ہوں آج اپنی بازگشت
ایک دن مجھ کو پکارا جائے گا

منتظر ہے آدمی افلاک سے
پھر من و سلویٰ اتارا جائے گا

آبیاری ہو رہی ہے خار کی
پھول کا صدقہ اتارا جائے گا

آندھیاں اب اور کیا لے جائیں گی
چار تنکوں کا سہارا جائے گا



کرتے ہیں لفاظی ہم
باتوں کے ہیں غازی ہم

حال میں اتنا کھوئے ہیں
بھول چکے ہیں ماضی ہم

جائیں گے کشکول بدست
دیکھیں گے فیاضی ہم

بھول چکے ہیں طوفاں میں
اپنی سبک پروازی ہم

خود ہم کو بھی حیرت ہے
کیسے ہوئے تھے راضی ہم

اس کی خوشی تھی جو ملحوظ
جان کے ہارے بازی ہم

قاضی سے کیا لینا دینا
تم راضی تو راضی ہم



مرے سامنے آ گیا وہ اکڑ کے
سکھایا جسے چلنا انگلی پکڑ کے

کہیں گر نہ جانا فلک سے زمیں پر
ہواؤں کی رسی پکڑنا جکڑ کے

لگاتے ہیں چکر ہم ان کی گلی کا
کبھی شام ڈھلتے کبھی خوب تڑکے

اگر تیرے دم سے ہے آباد کوئی
تو برباد میں بھی ہوں چکر میں پڑ کے

زمیں کی لکیروں سے لے لو گواہی
مرا ہے یہاں کوئی ایڑی رگڑ کے

جہاں پر ٹھہرنے سے ڈرتی ہے دنیا
وہیں جا کے بیٹھا ہے جاوید اڑ کے



روشنی کا گذر مکان میں کیا
کوئی سورج ہے سائبان میں کیا

جھوٹ پر جھوٹ بولے جاتے ہو
کچھ کمی رہ گئی ہے شان میں کیا

ذکر میرا ضرور آئے گا
ورنہ رکھا ہے داستان میں کیا

جو مخالف تھے ساتھ ہیں میرے
کچھ کشش ہے مری زبان میں کیا

تھک گئے ہیں پکارنے والے
کوئی رہتا نہیں مکان میں کیا

بولنا ہے تو زور سے بولو
پھونکتے ہو ہمارے کان میں کیا



ہوا نصیب نہ سایہ نہ سائبان مجھے
کبھی تو چین سے رہنے دے آسمان مجھے

مری تو کوئی بھی سنتا نہیں جہاں جاؤں
سنا رہے ہیں سبھی اپنی داستان مجھے

بھنور میں آ گئی کشتی خدا محافظ ہے
میں بادبان کو تکتا ہوں، بادبان مجھے

ہر ایک سمت سے پتھر چلے مری جانب
ہوا وجود کا اپنے بھی کچھ گمان مجھے



وہ اپنا ہے ہرگز پرایا نہیں ہے
کبھی جس کو خوابوں میں دیکھا نہیں ہے

بھروسا بہت ہے مجھے زندگی پر
مگر زندگی کا بھروسا نہیں ہے

وہ پہچانتا تو نہیں مجھ کو لیکن
نہیں جانتا مجھ کو ایسا نہیں ہے

مجھے ایک دن سوچنا ہی پڑے گا
کبھی اپنے بارے میں سوچا نہیں ہے

اگر دیکھئے تو تماشا ہے دنیا
اگر سوچئے تو تماشا نہیں ہے

سلیقے سے ہم بات کرتے ہیں ان سے
جنھیں گفتگو کا سلیقہ نہیں ہے

ترے ناز جب سے اٹھائے ہیں میں نے
کوئی کام اب میرے بس کا نہیں ہے



تھا وہ بہت حیرانی میں
دیکھ کے چہرہ پانی میں

نوچ لیا پر تتلی کا
بچے نے نادانی میں

نازک رشتے ٹوٹ گئے
مفت کی کھینچا تانی میں

جھیل میں چہرہ کیا دیکھا
آگ لگا دی پانی میں

لوٹ کے سیدھے گھر آئے
کیا پایا مہمانی میں

زلفوں میں وہ خوشبو ہے
جیسے رات کی رانی میں

لہریں گنتا رہتا ہوں
پھینک کے پتھر پانی میں



خبر کیا تھی فضیحت میں وہ میری جان کر دیں گے
مجھے بھی ایک دن کے واسطے سلطان کر دیں گے

ہمارے ساتھ اٹھنا بیٹھنا یوں ہی رہا تو پھر
تمھیں ہم آدمی سے ایک دن انسان کر دیں گے

جو فرصت ہو تو ہم سے بھی ملا کر دیکھ لے نظریں
تری آنکھیں چرا لیں گے تجھے حیران کر دیں گے

لٹاتے آ رہے ہیں علم کی دولت زمانے سے
بچا رکھا ہے جو کچھ ہم اسے بھی دان کر دیں گے

تمہارا ظلم بڑھتا جائے گا یوں ہی تو پھر اک دن
ہمیں بھی دیکھنا ہم جنگ کا اعلان کر دیں گے

وہ اپنی حرکتوں سے باز آیا ہے نہ آئے گا
اسے ہم کنکری ماریں گے اور شیطان کر دیں گے



موجوں کا شور و شر ہے برابر لگا ہوا
دریا سے اس قدر ہے مرا گھر لگا ہوا

ایسا نہ ہو کہ ٹوٹ پڑے سر پہ آسماں
ہے کچھ دنوں سے مجھ کو بڑا ڈر لگا ہوا

اب اس کے شر سے خود کو بچانا بھی ہے مجھے
رہتاہے میرے ساتھ جو اکثر لگا ہوا

حد چھو رہی تھی رات جہاں تشنگی مری
تھا اس کے بعد ایک سمندر لگا ہوا

سناٹے چیختے ہیں مرے چار سو مگر
دل میں ہے اضطراب کا محشر لگا ہوا

دشمن کی بات چھوڑیئے حیرت ہے خود مجھے
گردن سے آج بھی ہے مرا سر لگا ہوا

تکتا ہوں بے قرار نگاہوں سے باربار
ہے آسماں سے میرا کبوتر لگا ہوا



بڑے شہروں میں دیکھا ہے زیادہ تر نہیں ملتا
مکاں تو خوب ملتے ہیں مگر اک گھر نہیں ملتا

لہو میں تر یہاں ہر ایک سر ملتا تو ہے لیکن
تعجب ہے کسی کے ہاتھ میں پتھر نہیں ملتا

ملا کرتے ہیں تخت و تاج نا اہلوں کو دنیا میں
کسی بھی تاج کو لیکن مناسب سر نہیں ملتا

صنم خانے تو ہر جانب ہیں لیکن بت بنانے کو
یہاں پتھر تو ملتے ہیں کوئی آذر نہیں ملتا

غرض شامل ہے اس کی خاکساری میں کوئی ورنہ
کبھی وہ شخص مجھ سے اس طرح جھک کر نہیں ملتا

تمنا تھی کہ تجھ کو دیکھتا میں پاس سے اک دن
مگر اے زندگی مجھ کو ترا محور نہیں ملتا



سینے میں درد آنکھ میں آنسو نہیں ہے کیا
تم میں کسی شریف کی خو بو نہیں ہے کیا

کرنے لگے ہو شعلہ بیانی ہر ایک سے
اپنی زبان پر تمھیں قابو نہیں ہے کیا

ہر شخص کر رہا ہے درندوں کی بات کیوں
ان جنگلوں میں ایک بھی آہو نہیں ہے کیا

میں کیوں تلاش کرتا پھروں ہمسفر کوئی
خوابِ سفر میں ساتھ مرے تو نہیں ہے کیا

معدوم ہو چکے ہیں ستارے تو کیا ہوا
آنکھوں میں تیری ایک بھی جگنو نہیں ہے کیا



تصور میں بسا رکھا ہے جو وہ گھر بناؤں گا
زمیں پر کیا بنے گا محض کاغذ پر بناؤں گا

مجھے پہلے مکاں شیشے کا اک تیار کرنا ہے
پھر اس کے گرد پتھر کے نئے منظر بناؤں گا

قلم سے پیٹ بھرتا ہے نہ اپنا تن ہی ڈھکتا ہے
قلم کو توڑ دوں گا اور اب خنجر بناؤں گا

تجھے چھونا کسی صورت مرے بس میں نہیں لیکن
تری صورت تصور کو ترے چھو کر بناؤں گا

بگولا بن کے اڑتی پھر رہی ہے جو فضاؤں میں
یہ سوچا ہے اسی مٹی سے میں ساغر بناؤں گا

جو فرصت ہو تو تھوڑی دیر میرے پاس آ بیٹھو
تمھیں دیکھوں گا اور پھر صبح کے منظر بناؤں گا



وہ نہ شرمندہ ہو چشم تر دیکھ کر
چل دیئے دور سے اک نظر دیکھ کر

پست ہمت مجھے سب سمجھنے لگے
میرے دشمن کے شانے پہ سر دیکھ کر

اس کی پرواز دیکھی نہیں آپ نے
مطمئن ہو گئے بال و پر دیکھ کر

راستے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے
ورنہ خوش تھے مسافر شجر دیکھ کر

اشرفیت پہ خود اپنی کرتا ہے شک
آج کا آدمی جانور دیکھ کر

سخت حیران ہے آج پاگل ہوا
پھول تنہا کھلا شاخ پر دیکھ کر



آنکھیں تو بچھائے ہوں نظر آئے نہ آئے
یہ گھر تو اسی کا ہے وہ گھر آئے نہ آئے

تپتی ہے زمیں سر پہ ہے جلتا ہوا سورج
رستے میں مسافر کے شجر آئے نہ آئے

وہ آج سمندر پہ بہت ٹوٹ کے برسا
یہ سیپ کی قسمت کہ گہر آئے نہ آئے

میں دل کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہوں
آنکھوں سے مجھے کچھ بھی نظر آئے نہ آئے

سورج کو نکلنا ہے وہ نکلے گا بہرحال
یہ میرا مقدر ہے سحر آئے نہ آئے

یہ سوچ کے ٹھہرے نہ کسی موڑ پہ جاوید
پھر بعد سفر کوئی سفر آئے نہ آئے



میرا خود سے ملنے کو جی چاہتا ہے
بہت اپنے بارے میں میں نے سنا ہے

سکوں سے کوئی گھر میں بیٹھا ہوا ہے
کوئی خواب میں دوڑتا بھاگتا ہے

ادب میں بہت کچھ پرانا ہے لیکن
ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا کچھ نیا ہے

جہاں آندھیوں نے جمائے تھے ڈیرے
ابھی تک وہاں ایک روشن دیا ہے

کوئی سو رہا ہے اجالے میں دن کے
کوئی رات کے خوف سے جاگتا ہے

مجھے حال دل کا سنانا ہے جس کو
اسے میرے بارے میں سب کچھ پتہ ہے

عجب شور محشر بپا ہے یقیناً
کسی شاخ سے کوئی پتا گرا ہے



میاں وہ بھی وہی کرتا ہے جو شیطان کرتا ہے
کسی کی جان تو لیتا نہیں ، ہلکان کرتا ہے

کوئی بھی کام مالک کا میں کرتا تو نہیں پھر بھی
مرا مشکل کشا، مشکل مری آسان کرتا ہے

تعجب ہے مرے اجداد سے لوٹی ہوئی دولت
سخاوت دیکھئے اس کی مجھی کو دان کرتا ہے

سبھی اک دوسرے سے خوف کھاتے ہیں یہاں لیکن
یہ دیکھیں کون ہے جو جنگ کا اعلان کرتا ہے

وہ یہ بھی چاہتا ہے خوش مجھے دیکھے سدا لیکن
مہیا خود ہی میرے درد کے سامان کرتا ہے

کبھی خلوت کبھی جلوت میں دیکھا ہے یہی جاوید
جو کام آنکھیں نہ کر پائیں وہ اکثر کان کرتا ہے



مرے دل میں ہمزاد میرا نہاں ہے
حقیقت نہیں گر یہ سب کچھ گماں ہے

بھنور میں گھرا ہوں خدا مہرباں ہے
یہ طوفاں وہ کشتی ادھر بادباں ہے

مسلسل زمیں میں دھنسا جا رہا ہوں
مرے سر پہ کیا اک نیا آسماں ہے

جہاں تشنگی اپنی حد چھو رہی ہے
وہاں اب سنا کوئی دریا رواں ہے

میں اپنا کہا خود ہی سنتا ہوں جاوید
میرا دل یہاں پر مرا ہم زباں ہے



ہاتھ میں جب ہنر نہیں ہوتا
سر چھپانے کو گھر نہیں ہوتا

چین ترک تعلقات میں ہے
جانتا ہوں مگر نہیں ہوتا

عیب تھوڑا بہت سبھی میں ہے
شر سے خالی بشر نہیں ہوتا

ہاں یہ سورج حیات بخش سہی
دھوپ کھا کر گذر نہیں ہوتا

ایک پتہ بغیر مرضی کے
کیوں ادھر سے ادھر نہیں ہوتا

مفلسوں میں گذار سکتا ہوں
مفلسی میں گذر نہیں ہوتا

کوئی تجھ سا جہاں میں اے جاوید
اس طرح در بدر نہیں ہوتا



مرنا بھی پڑے تو بھی یہی کام کریں گے
سورج کو کسی روز تہ دام کریں گے

بیکار کے کاموں میں ابھی الجھے ہیں ہم لوگ
فرصت جو ملے گی تو کوئی کام کریں گے

ممکن ہے کہ لے جائے زلیخا کوئی ہم کو
خود کو کسی بازار میں نیلام کریں گے

زد میں جو ہواؤں کی پڑے رہتے ہیں،اک روز
روشن تری خاطر وہ در و بام کریں گے

جاوید بگولے کی سی فطرت ہے ہماری
ہم صبح یہاں اور وہاں شام کریں گے



نئی زمین نیا آسماں بناتے ہیں
ہم اپنے واسطے اپنا جہاں بناتے ہیں

بجھی بجھی سی وہ تصویر جاں بناتے ہیں
کہیں چراغ کہیں پر دھواں بناتے ہیں

بیان کرتے ہیں ہم داستان لفظوں میں
ذرا سی بات کی وہ داستاں بناتے ہیں

چمکتی دھوپ میں کرنیں سمیٹتے ہیں ہم
انہیں کو تان کے پھر سائباں بناتے ہیں

سکون دل کے لئے ہم بھی روز کاغذ کے
کبھی تو پھول کبھی تتلیاں بناتے ہیں

جو مد و جزر سے واقف نہیں ہیں دریا کے
وہ ساحلوں پہ ہی اکثر مکاں بناتے ہیں

بناتے رہتے ہیں جاوید کشتیاں لیکن
ہم ان کے واسطے پھر بادباں بناتے ہیں



پوچھا ہی نہیں اس نے کبھی حال ہمارا
بس یوں ہی گذر جاتا ہے ہر سال ہمارا

رہتی ہے خبر سارے زمانے کی ہمیں بھی
پھیلا ہے بہت دور تلک جال ہمارا

مشکل ہے کسی کام کا ہونا بھی یہاں پر
ہو جاتا ہے ہر کام بھر حال ہمارا

ہم نے تو نمائش بھی لگائی نہیں پھر بھی
بازار میں چل جاتا ہے ہر مال ہمارا

پہچان زمانے سے الگ ہی ہے ہماری
ملتا نہیں ہر ایک سے سُرتال ہمارا

ممکن ہے کہ بن جائیں شہنشاہ غزل ہم
ویسے تو ارادہ نہیں فی الحال ہمارا



میں کیسے لوٹ کے جاؤں گا اپنے گھر یارو
کے میرے قدموں سے لپٹی ہے رہگذر یارو

نہ راس آئے گا مجھ کو کوئی شجر یارو
ابھی طویل بہت ہے مرا سفر یارو

ابھی تو شانوں پہ قائم ہے میرا سر یارو
جنوں نہیں ہے ابھی میرا معتبر یارو

ستم تو دیکھئے پرواز کی دعا دے کر
کتر رہا ہے کوئی میرے بال و پر یارو

وہ ایک لمحہ کہ جو حاصل حیات بنے
تلاش کرتا ہے انسان عمر بھر یارو

میں آسماں ہوں بلندی مقام ہے میرا
جھکائے پھرتا ہوں پھر بھی میں اپنا سر یارو

تمام عمر کا حاصل ہنسی گھڑی بھر کی
کہاں سے لائے کوئی پھول کا جگر یارو



کبھی جب ہاتھ میں ہم میرؔ کا دیوان لیتے ہیں
تو پھر اوقات اپنی خود بخود پہچان لیتے ہیں

سنا تھا اپنے آگے وہ کسی کی بھی نہیں سنتے
خدا جانے ہماری بات کیسے مان لیتے ہیں

تعلق ہے اگر مذہب سے ہم سب کو تو بس اتنا
قسم کھانے کو اکثر ہاتھ میں قرآن لیتے ہیں

بھنویں ہوں، صبر کی چادر ہو یا تلوار ہو جاوید
جہاں جس کی ضرورت ہو اسی کو تان لیتے ہیں



مجھ کو خبر تھی کھیل میں خطرہ ہے جان کا
بدلا نہ پھر بھی میں نے ارادہ اڑان کا

وہ تو زمین تھی کہ مرا بار سہ گئی
مجھ سے تو بوجھ اٹھ نہ سکا آسمان کا

پہچان تو رہا ہے ہوا کے بہاؤ کو
رخ کیسے پھیر لے کوئی اپنے مکان کا

قائم تھا اپنی ضد پہ وہ، میں اپنی بات پر
رستہ نکل سکا نہ کوئی درمیان کا

باقی ہے دل میں درد کی لذت ابھی تلک
میں بے خبر ہوں تیر تھا کس کی کمان کا



ابھی زور طوفاں کا یوں بھی نہیں ہے
مگر کوئی گھر جوں کا توں بھی نہیں ہے

ابھی تو مرا سر ہے شانوں پہ قائم
ابھی معتبر کچھ جنوں بھی نہیں ہے

ضرورت کی ہر شے مہیا ہے لیکن
یہ کیا ہے کہ دل کو سکوں بھی نہیں ہے

خدا ایسی بے مایگی سے بچائے
کہ اب دل میں سوزِ دروں بھی نہیں ہے

انا کو میسر نہیں سرفرازی
مگر آج تک سرنگوں بھی نہیں ہے

کیا قتل کتنے سلیقے سے اس نے
کہ دامن پہ اک قطرہ خوں بھی نہیں ہے



آنکھوں میں بیج خواب کا بونے نہیں دیا
اک پل بھی اس نے چین سے سونے نہیں دیا

اشکوں سے دل کا زخم بھی دھونے نہیں دیا
مجھ کو خود اپنے حال پہ رونے نہیں دیا

یہ اور بات ہے وہ مرا ہو نہیں سکا
لیکن مجھے کسی کا بھی ہونے نہیں دیا

گم ہونا چاہتا تھا میں خود اپنے آپ میں
مجھ کو ترے گمان نے کھونے نہیں دیا

شامل ہے اس کی ذات میں میرا وجود بھی
تنہا کسی بھی موڑ پہ ہونے نہیں دیا



خود اختیار میں نے کی راہ فرار بھی
میں ہی تمام عمر رہا بے قرار بھی

فطرت میں کچھ غرور ہے کچھ انکسار بھی
دیکھا ہے میں نے آپ کا غصہ بھی پیار بھی

تسلیم کر چکا ہوں میں خود اپنی ہار بھی
جیتا نہیں وہ مجھ سے مگر ایک بار بھی

کچھ خار بھی چبھے ملے پھولوں کے ہار بھی
دیکھا ہے میں نے دور خزاں بھی بہار بھی

حالانکہ زندگی کا نہیں اعتبار بھی
کرتا ہوں زندگی پہ مگر جاں نثار بھی

کاغذ کی ایک ناؤ پہ ہم ہیں سوار بھی
دعویٰ ہے جائیں گے کبھی دریا کے پار بھی



گو زمانہ نظر سے گراتا رہا
پھر بھی میرا تو کچھ بھی نہ جاتا رہا

چشم جاناں میں غوطے لگاتا رہا
جھیل میں اک پرندہ نہاتا رہا

میرے دل کو جلانے کی سازش میں وہ
عمر بھر اپنے دل کو جلاتا رہا

روشنی والے جلتے رہے دیکھ کر
اک ستارہ تھا میں جگمگاتا رہا

میں خیالوں میں گم تھا کسی اور کے
میرے دل میں کوئی گھر بناتا رہا

در تھا جاوید دل کا کھلا جب تلک
کوئی آتا رہا کوئی جاتا رہا



جانتا ہوں حریف جاں ہیں سب
ہاں مگر آج کل کہاں ہیں سب

ایک میں ہی زمیں کی صورت ہوں
اور باقی تو آسماں ہیں سب

کون میری زباں سمجھتا ہے
یوں تو کہنے کو ہم زباں ہیں سب

میں سبھی کا یقین کرتا ہوں
اور مجھ سے ہی بدگماں ہیں سب

سن کے ساری حقیقتیں میری
لوگ بولے کہ داستاں ہیں سب

کون سی مصلحت ہے جو مجھ پر
اس قدر آج مہرباں ہیں سب



صرف کہنے کو زندگی کچھ ہے
یہ کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ ہے

ایک دل کو سکوں نہیں ملتا
ورنہ کہنے کو یوں سبھی کچھ ہے

تیرگی میں بھی دیکھ سکتا ہوں
دل کی آنکھوں میں روشنی کچھ ہے

دیکھ کر دوسروں کو ہنستے تھے
اپنی حالت بھی اب وہی کچھ ہے

کچھ تو ہے بے قراری مجھ کو بھی
اور اس کو بھی بے کلی کچھ ہے



کج روی نے کر دیا ہے اس قدر اِدھر اُدھر
چار دن میں ہو گیا اُدھر اِدھر ، اِدھر اُدھر

ہم بسائے پھر رہے ہیں اس لئے نگاہ میں
ہو نہ جائے بھیڑ میں وہ ہم سفر اِدھر اُدھر

جانے کس کی یاد تھی کہ نیند میری اڑ گئی
لے رہا تھا کروٹیں میں رات بھر اِدھر اُدھر

ہم کسی سبب سے گر وہاں نہیں ملیں تو پھر
آپ دیکھ لیجئے گا اک نظر اِدھر اُدھر

جسم سارا تھک کے سو گیا ہے دوستو مگر
پھر رہا ہے خواب میں بھی میرا سر اِدھر اُدھر



میں چاہتا ہوں دوستوں سے دوستی بنی رہے
جو چھاؤں پیڑ کی گھنی ہے عمر بھر گھنی رہے

مرے خلاف ان دنوں مہم سی چل پڑی ہے پھر
مرے خدا مری یہ چادرِ انا تنی رہے

یہی مری دعا ہے تیری خوشبوؤں سے چار سو
فضا میں تازگی رہے ہوا میں سنسنی رہے

جو دوسروں کے واسطے پیام ہے خلوص کا
وہی نگاہ کیوں ہمارے واسطے انی رہے

مرے خدا مجھے کچھ اس صفت سے بھی نواز دے
مزاج میں شگفتگی، زباں میں چاشنی رہے

حیات مستعار چار دن کی ہے اسی لئے
میں چاہتا نہیں کہ تم سے عمر بھر ٹھنی رہے



ہمارے دشت میں آواز دو آہو نکلتا ہے
تمہارے شہر میں ہر بات پر چاقو نکلتا ہے

بچھا رکھا ہے چاروں سمت میں نے جال نظروں کا
کدھر سے دیکھتا ہوں آج بچ کر تو نکلتا ہے

کوئی بھی راستہ اس کا مرے گھر تک نہیں آتا
مجھے معلوم ہے وہ شہر میں ہر سو نکلتا ہے

جنوں میں آج بھی ناکام ہیں ہم دوستو پھر بھی
یہ دیکھیں کیا کوئی اب دوسرا پہلو نکلتا ہے

زمیں پر ٹوٹ پڑتی ہیں بلائیں آسمانوں کی
کسی مظلوم کی آنکھوں سے جب آنسو نکلتا ہے



رگ جاں میں فشار خوں تو ہے
مجھ میں باقی ابھی جنوں تو ہے

عیش و عشرت کے واسطے گھر میں
کچھ نہیں ہے مگر سکوں تو ہے

اب تعلق نہیں کوئی اس سے
ملنا جلنا ہمارا یوں تو ہے

اپنا گرویدہ کر لیا ہم کو
اس کے لہجے میں کچھ فسوں تو ہے

سر بلندی پہ ناز تھا جس کو
میرے آگے وہ سرنگوں تو ہے

یوں بظاہر بجھا ہوا ہوں میں
دل میں کچھ آتش دروں تو ہے



آئے تو کئی لوگ مرے سنگ زمیں پر
میں نے ہی جمایا ہے مگر رنگ زمیں پر

ہونے لگا اس خطے کی وسعت میں اضافہ
جس دن سے دھرے میں نے قدم تنگ زمیں پر

سیراب بھی کر دیں مگر اگتا نہیں کچھ بھی
گل ہم نے کھلائے تھے اسی سنگ زمیں پر

اس راز سے واقف نہیں کچھ لوگ ابھی تک
قائم تو ہمیں سے ہے یہ آہنگ زمیں پر

آئے تو مقابل میں کئی رستم و سہراب
ٹھہرے وہ سبھی بس مرے پاسنگ زمیں پر



سنتا ہی نہیں آج کوئی بات ہماری
معلوم ہوئی اب ہمیں اوقات ہماری

دن ہے کہ سمٹتا ہے ضرورت سے زیادہ
پھیلی ہے مگر دور تلک رات ہماری

ہم خود پہ توجّہ کبھی دیتے نہیں ورنہ
کس پر نہیں ہوتی ہیں عنایات ہماری

ہم خشک زمینوں پہ ہی کرتے ہیں قناعت
قسمت میں کہاں لکھی ہے برسات ہماری

ہم حال بیاں کس سے کریں اپنا بتاؤ
ہوتی ہی نہیں ان سے ملاقات ہماری



کسی کو ابھی تک پتہ کچھ نہیں ہے
مری بند مٹھی میں کیا کچھ نہیں ہے

نگاہیں تو کچھ کچھ بیاں کر رہی ہیں
زباں سے پر اس نے کہا کچھ نہیں ہے

شکایت سبھی کو مجھی سے ہے ہردم
مجھے ان سے لیکن گلہ کچھ نہیں ہے

بہت کچھ دیا ہے زمانے کو ہم نے
زمانے سے ہم کو ملا کچھ نہیں ہے

سروں کو جہاں سب جھکائے ہوئے ہیں
وہاں سے مرا سلسلہ کچھ نہیں ہے



لشکر ہو اپنی ذات میں وہ فرد چاہیئے
میدان زندگی کے لئے مرد چاہیئے

زخموں پہ اب نمک بھی چھڑکتا نہیں کوئی
اللہ مجھ کو پھر کوئی ہمدرد چاہیئے

بستر وہ گرم کرنے پہ راضی تو ہے مگر
موسم مجھے کچھ آج ذرا سرد چاہیئے

چہرے کے سب نقوش عیاں کر نہ دے کہیں
اس آئینے پہ تھوڑی بہت گرد چاہیئے

اب جی اچٹ گیا ہے مرا لالہ زار سے
اس بار مجھ کو پھول کوئی زرد چاہیئے



یار سنو اک کام کرو
گھر جاؤ آرام کرو

بیٹھو اپنی کٹیا میں
صبح کرو یا شام کرو

فرصت ہو تو سورج کو
جا کر زیر دام کرو

سب کچھ کیوں ہو تمہارا ہی
کچھ تو میرے نام کرو

مجھ کو نصیحت کرتے ہو
جاؤ اپنا کام کرو

لکھو میری تعریفیں
یا مجھ کو بدنام کرو



من کا سانپ ہے بیکل مارو
ممکن ہو تو ہر پل مارو

جب بھی تم شیطان کو دیکھو
کنکر پھینکو، چپّل مارو

گھوڑے اور وزیر کو چھوڑو
سب سے پہلے پیدل مارو

برسوں سے یہ کاٹ رہے ہیں
کھٹیا پیٹو کھٹمل مارو

صاف دکھائی دے گا تم کو
اپنی آنکھ میں کاجل مارو

ہم پیتل کو سونا کر دیں
تم سونے پر پیتل مارو

چھوڑو دنیا کی یہ خواہش
نفس بہت ہے کھڑتل مارو



لوگ پڑے ہیں سر کے پیچھے
کیوں دیکھوں میں ڈر کے پیچھے

سنتا ہوں اب بھی رہتا ہے
کوئی میرے گھر کے پیچھے

خاموشی سے ہٹ جاتا ہے
کام وہ اپنا کر کے، پیچھے

تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے
کیسے کوئی سرکے پیچھے

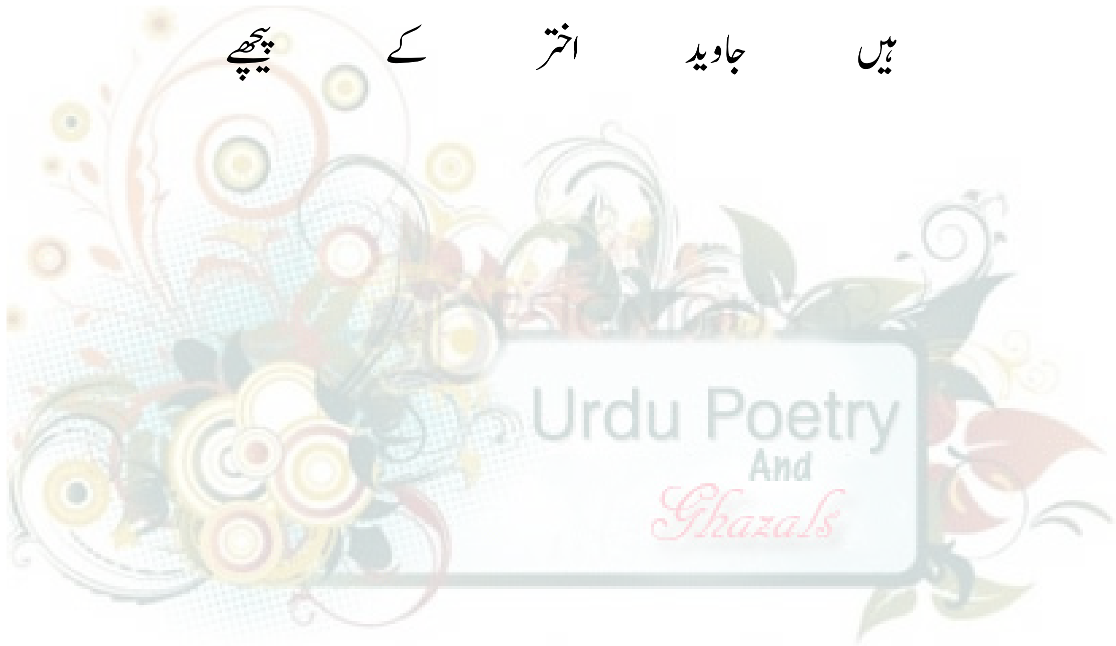
ساری دنیا بھاگ رہی ہے
چھوڑ کے سب کچھ زر کے پیچھے

چل کے ذرا دیکھیں تو کیا ہے
آخر اس منظر کے پیچھے

درد و الم کا اک صحرا ہے
اس کی چشم تر کے پیچھے

اک سناٹا گونج رہا ہے
شہر کے شور و شر کے پیچھے

نئی نسل کے سارے شاعر
ہیں جاوید اختر کے پیچھے





جی بھر کر مدہوش رہو
خود سے ہم آغوش رہو

کھل کر سامنے آ جاؤ
یا پھر تم روپوش رہو

محفل میں کچھ کہنے سے
بہتر ہے خاموش رہو

جب کوئی عالم بولے
یار ہمہ تن گوش رہو

ہم کچھوے کی چال چلیں
تم ہی بنے خرگوش رہو

ہم ہیں میؔر کے شیدا، تم
حلقہ بگوشِ جوؔش رہو



علاقہ ہے کہنے کو سارا ہمارا
نہیں ہے کہیں بھی گذارا ہمارا

وہی جس نے صدقہ اتارا ہمارا
اسی نے کیا وارا نیارا ہمارا

ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں ہے
یہ رشتہ ہے کیسا تمھارا ہمارا

نگاہیں سبھی کی ہیں مرکوز جس سمت
ادھر تو نہیں تھا اشارہ ہمارا

یہی دیکھ کر محوِ حیرت ہے دنیا
ابھی تک ہے روشن ستارہ ہمارا

کسی کے سہارے کے محتاج ہیں ہم
کوئی ڈھونڈتا ہے سہارا ہمارا



کسی کی فکر رہتی ہے نہ اپنا ہوش رہتا ہے
مگر کچھ کر گذرنے کا لہو میں جوش رہتا ہے

کسی کو جاننا آسان ہے پہچاننا مشکل
جسے دیکھو وہ اپنی ذات میں روپوش رہتا ہے

صدائیں خود کو دیتا ہے مگر اپنی صداؤں کو
وہ سننے کے لئے خود ہی ہمہ تن گوش رہتا ہے

کبھی بے چین رہتا ہے کسی کی یاد میں تو بھی
کبھی تیرے خیالوں میں کوئی مدہوش رہتا ہے

قیامت ہے ترے آگے کسی کا لب کشا ہونا
نگاہیں بات کرتی ہیں دہن خاموش رہتا ہے



نظر سے دور ہوتے جا رہے ہیں
سراپا نور ہوتے جا رہے ہیں

جنھیں بدنام کرنا چاہتے ہو
وہی مشہور ہوتے جا رہے ہیں

ہم آغازِ سفر سے پہلے ہی کیوں
تھکن سے چور ہوتے جا رہے ہیں

بڑھی ہے روشنی تہذیب نو کی
مکاں بے نور ہوتے جا رہے ہیں

ہر اک اپنا جنازہ ڈھو رہا ہے
سبھی مزدور ہوتے جا رہے ہیں

کھلے تھے پھول زخموں کے جو اک دن
وہ اب ناسور ہوتے جا رہے ہیں



چاہتا ہوں مگر نہیں سوتا
میں کبھی نیند بھر نہیں سوتا

پہلے سوتی تھی چین سے دنیا
اب کوئی بے خبر نہیں سوتا

نونہالوں کی فکر ہے شاید
گھر کا بوڑھا شجر نہیں سوتا

پہلے آتی نہیں تھی نیند مجھے
اب مرا چارہ گر نہیں سوتا

روشنی بانٹنے کی چاہت میں
اک دیا رات بھر نہیں سوتا

سو بھی جاتا ہے جسم تھک کے مگر
کیا کروں میرا سر نہیں سوتا



نہ سمجھے وہ مقابل اب کوئی کمزور بیٹھا ہے
اگر ہے سانپ اس جانب ادھر بھی مور بیٹھا ہے

بظاہر تو بہت خاموش ہیں موجیں سمندر کی
مگر تہہ میں کہیں چھپ کر غضب کا شور بیٹھا ہے

سبب کیا ہے ملاتا ہی نہیں نظریں زمانے سے
یہ لگتا ہے کہ اس کے دل میں کوئی چور بیٹھا ہے

نچاتا ہے جو دنیا کو اب اپنے ہر اشارے پر
وہ اپنے ہاتھ میں لے کر کوئی تو ڈور بیٹھا ہے

کوئی سازش یقیناً ہے زمینوں کو ڈرانے کی
فلک پہلو میں لے کر پھر گھٹا گھنگھور بیٹھا ہے



کبھی شاداں کبھی منت کشِ فریاد رہتے ہیں
ہمارے خانۂ دل اس طرح آباد رہتے ہیں

دلوں میں حوصلہ تو ہے مگر تیشہ نہیں ملتا
ہمارے شہر میں یوں تو کئی فرہاد رہتے ہیں

اسیری ہو نہ جائے تیری قسمت باخبر رہنا
یہ سنتے ہیں یہاں ہر گام پرصیّاد رہتے ہیں

ہمارے سر پہ آفت لاکھ آتی ہے مگر پھر بھی
شکن ماتھے پہ پڑتی ہے نہ ہم ناشاد رہتے ہیں

تعلق ہے ہمارا مغربی بنگال سے جاوید
مگر ہم ایک مدت سے الٰہ آباد رہتے ہیں



وہ انسان بھی ہو سکتا ہے
اور حیوان بھی ہو سکتا ہے

شہر دل آباد ہے اب تک
کل ویران بھی ہو سکتا ہے

ہم جس کو پہچان رہے ہیں
وہ انجان بھی ہو سکتا ہے

فائدہ تو ہے عشق میں لیکن
کچھ نقصان بھی ہو سکتا ہے

اس کی سست روی مت دیکھو
وہ طوفان بھی ہو سکتا ہے

دور سے جو پانی دکھتا ہے
ریگستان بھی ہو سکتا ہے

کچھ غزلیں میں اور کہوں تو
اک دیوان بھی ہو سکتا ہے



خوش رنگ خوشگوار نظارے نہیں رہے
جھیلیں اداس ہیں کہ شکارے نہیں رہے

کیسے کٹے گی ہجر کی اب یہ طویل شب
گنتی کے بھی فلک پہ ستارے نہیں رہے

اب ان کی خیریت نہ کبھی ہم سے پوچھنا
ان سے تعلقات ہمارے نہیں رہے

ہم دن گذارتے تھے کبھی جن کی چھاؤں میں
وہ پیڑ بھی ندی کے کنارے نہیں رہے

جاوید ان سے مل کے چلو دیکھتے ہیں ہم
ہیں بھی ہمارے وہ کہ ہمارے نہیں رہے



جو میرے ذہنِ رسا سے اڑان بھرتا ہے
مرے خلاف وہی سب کے کان بھرتا ہے

زمین پاؤں کے نیچے رہے تو کیسے رہے
وہ اپنی جیب میں جب آسمان بھرتا ہے

جو دل کا زخم تھا اچھا تو ہو گیا لیکن
صدی گذرتی ہے تب یہ نشان بھرتا ہے

عجیب حکم ہے دو ایک پر قناعت کر
بہت سے پھول ہوں تب جا کے لان بھرتا ہے

عطا تو کی ہے اسی نے نظر کو گویائی
وہ بے زبان کے منہ میں زبان بھرتا ہے



اب تک تو دیکھنے کو یہ منظر نہیں ملا
شیشے کے شہر میں کہیں پتھر نہیں ملا

آندھی تمام پیڑ گرا کر چلی گئی
بدقسمتی سے اس کو مرا گھر نہیں ملا

پانی عمیق جھیل کا لہرا کے سو گیا
جذبات کے پرند کو شہپر نہیں ملا

بدنامیاں، فریب، گھٹن، دل شکستگی
جو لطف جیتے جی تھا وہ مر کر نہیں ملا

نااہل ہو کے تاج ملا یہ مرا نصیب
یہ تاج کا نصیب اسے سر نہیں ملا

جاوید یوں تو سیکڑوں آشفتہ سر ملے
تجھ سا جہاں میں کوئی قلندر نہیں ملا



کبھی کچھ سوز ہوتا ہے کبھی کچھ ساز ہوتا ہے
ہمارے شعر کہنے کا عجب انداز ہوتا ہے

جو آئے ہیں تمہارے شہر میں تو یہ بھی دیکھیں گے
یہاں پر صبح نو کا کس طرح آغاز ہوتا ہے

سوا میرے کسی کے کچھ سمجھ میں بھی نہیں آتا
تمہاری گفتگو کا بس یہی اک راز ہوتا ہے

اگر سچ ہے تو ہم اک روز چل کر دیکھ لیتے ہیں
سنا ہے آئینہ چہروں کا خود غماز ہوتا ہے

ہنسو بولو حصارِ خامشی اب توڑ بھی ڈالو
ذرا سی بات پر اتنا کوئی ناراض ہوتا ہے

کبھی اپنا کہا خود کو گزرتا ہے گراں لیکن
کبھی اپنے کہے پر خود ہمیں بھی ناز ہوتا ہے



وہ میرے نزدیک نہیں ہے
موسم بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے

جو کچھ تجھ سے مانگ رہا ہوں
حق ہے میرا، بھیک نہیں ہے

جانے وہ کب کیا کر ڈالے
اس کا کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے

کچھ تعریفیں بھی ہیں شامل
صرف مری تضحیک نہیں ہے

روشن اب بھی ہے اک تارہ
رات بہت تاریک نہیں ہے

اس کو باآسانی پڑھئے
حرف کوئی باریک نہیں ہے



زمیں سے اٹھے ہیں یا آسماں سے آئے ہیں
یہ لوگ شہر میں جانے کہاں سے آئے ہیں

انہیں کو حق ہے بہاروں کے خیر مقدم کا
گذر کے جو کسی دور خزاں سے آئے ہیں

ہدف کوئی ہو، کہیں ہو یقین ہے مجھ کو
یہ سارے تیر اسی کی کماں سے آئے ہیں

وہاں سے لوٹ کے آنے کا دل نہ کرتا تھا
پلٹ کے شہر میں اپنے جہاں سے آئے ہیں

یہ کون لوگ ہیں ملنے کے واسطے ہم سے
ادھر اُدھر سے، یہاں سے وہاں سے آئے ہیں



شور یہ کیسا اندر ہے
شاید روز محشر ہے

میں بہتر ہوں اوروں سے
کوئی مجھ سے بہتر ہے

بوجھ ایک اترا کاندھے کا
سر لیکن گردن پر ہے

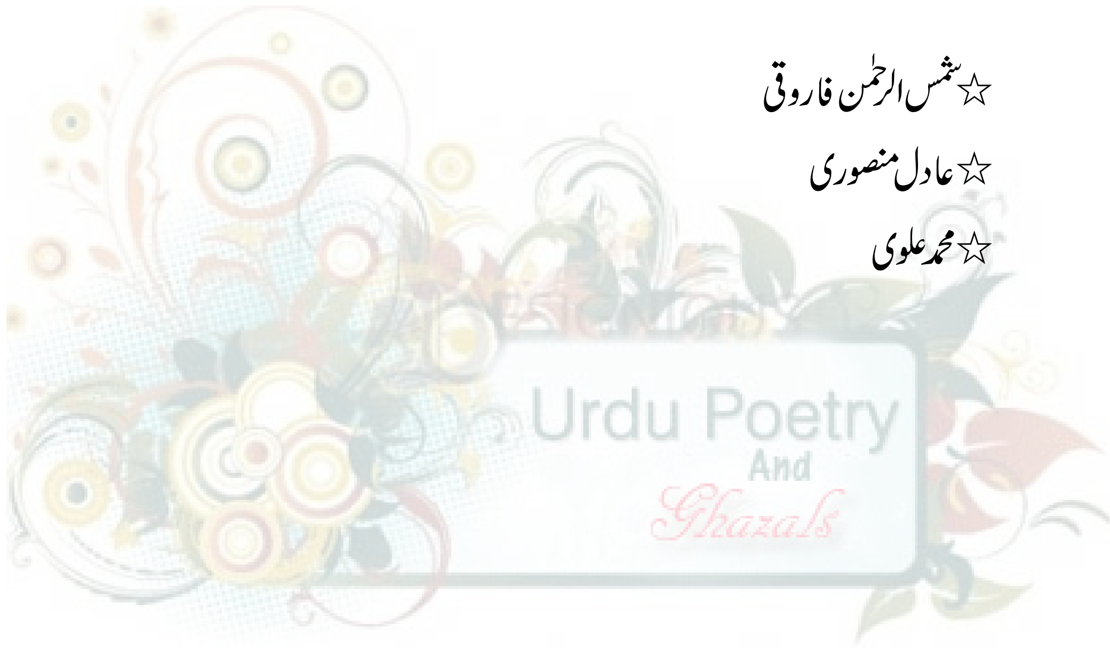
میں اس کا گرویدہ ہوں
جانے یہ کیا چکر ہے

وہ تو ہے ایک شیشہ گر
پھر کیوں ہاتھ میں پتھر ہے

شاید میری غزلوں میں
میرا اپنا تیور ہے

فاروقی☆ کو دیکھو تو
علم کا ایک سمندر ہے

عادل☆ اور علوی☆ کے بعد
خواجہ جاوید اختر ہے



☆شمس الرحمٰن فاروقی
☆عادل منصوری
☆محمد علوی



سب اس کی محفل میں ہیں
اور ہم اس کے دل میں ہیں

کل تک تو خوش حال تھے ہم
آج بڑی مشکل میں ہیں

روشن امکانات مرے
سارے مستقبل میں ہیں

بے پردہ ہیں لیلائیں
اور مجنوں محمل میں ہیں

مدت سے اک عزم لئے
ہم راہ و منزل میں ہیں

جب سے بلی جاگ اٹھی
سارے چوہے بل میں ہیں

اک دن بارآور ہوں گے
تخم جو آب و گل میں ہیں

سب کچھ اچھا ہے، اب ہم
عمر کی اس منزل میں ہیں





جس کوّے نے ہار گرایا
سب نے اس کو مار گرایا

صدیوں کا آثار گرایا
کس نے یہ مینار گرایا

ملّا نے تسبیح گرائی
پنڈت نے زنّار گرایا

طوفاں نے وہ پیڑ بھی جس کا
گرنا تھا دشوار، گرایا

دیکھ کے میرے شانوں پہ سر
دشمن نے ہتھیار گرایا

ایک غزل آزاد کہی تھی
غزلوں کا معیار گرایا



سر اٹھائے ہوئے جو شجر ہے میاں
اس پہ آندھی کی گہری نظر ہے میاں

کوئی دیوار ہے اور نہ در ہے میاں
یوں تو کہنے کو میرا بھی گھر ہے میاں

تم بھی خاموش ہو میں بھی چپ چاپ ہوں
زندگی کا یہ کیسا سفر ہے میاں

اس کے انجام سے کوئی واقف نہیں
ہر نظر پھول کے حسن پر ہے میاں

آج کے آدمی کا عجب حال ہے
لب تو خنداں مگر آنکھ تر ہے میاں



اپنے کئے پر جو شرمندہ ہوتا ہے
نئے سرے سے پھر وہ زندہ ہوتا ہے

جس میں پیار محبت اور اخلاص بھی ہو
شہر دل کا وہ باشندہ ہوتا ہے

جو کچھ کرنا تھا اس نے تو کر ڈالا
دیکھیں گے کیا کیا آئندہ ہوتا ہے

جی خوشیوں سے بھر جاتا ہے، جب میری
شاخِ دل پر کوئی پرندہ ہوتا ہے

راہ نمائی کرتا رہتا ہے سب کی
ایک ستارہ جو تابندہ ہوتا ہے

دنیا بھر کا کام اسی سے لیتا ہوں
مجھ میں جو میرا کارندہ ہوتا ہے



درندوں کی طرفداری میں جو شہ زور نکلے گا
ہمیں معلوم ہے وہ شخص آدم خور نکلے گا

بدل جائیں گی اک دن زہر آلودہ فضائیں بھی
نگلنے کے لئے سانپوں کو جس دن مور نکلے گا

مری بستی میں چھائی ہے خموشی ہر طرف لیکن
اگر دل کی سنو گے تو غضب کا شور نکلے گا

میں سر اپنا ہتھیلی پر لئے پھرتا رہا برسوں
خبر اس کی نہ تھی دشمن مرا کمزور نکلے گا

کوئی تو نیک طینت ہو کوئی تو صاف باطن ہو
جسے دیکھو اسی کے دل میں کوئی چور نکلے گا



آنکھ میں ہے انگارہ کچھ
جل ہی نہ جائے سارا کچھ

تاریکی چپ رہتی ہے
کہتا ہے اک تارا کچھ

جان نہ دیتا کیا کرتا
اور نہیں تھا چارہ کچھ

غیروں میں تقسیم ہوا
بس میرا ہی سارا کچھ

لمحوں میں کر سکتا ہے
میرا ایک اشارہ کچھ

ذہن ہمارا برسوں سے
پھرتا ہے آوارہ کچھ



گماں تو ٹھیک میں کیسے کہوں یقین بھی ہے
کہ میرے پاؤں کے نیچے کہیں زمین بھی ہے

دلوں میں دنیا بسائے ہوئے تو پھرتے ہو
خیال رکھنا کہ دنیا کے ساتھ دین بھی ہے

ہمارے جیب و گریباں میں سانپ کیا ملتا
اسے خبر ہی نہیں تھی کہ آستین بھی ہے

ترس جو کھا کے کسی جانور پہ شاہ بنے
ہجوم شاہ میں کوئی سبکتگین بھی ہے

سخن شناس نہیں ،زودگو بھی ہے جاوید
پڑھا لکھا ہی نہیں آدمی ذہین بھی ہے



چاہتے ہیں کہ چلے جائیں مگر کیا جائیں
جیب بھی پیٹ سی خالی ہو تو گھر کیا جائیں

خوب ہے تیری گلی پھر بھی انا کہتی ہے
جس طرف ہو کے چلے آئے ادھر کیا جائیں

دو گھڑی چھاؤں تو مل جاتی مگر دور تلک
نام کو بھی تو نہیں کوئی شجر ،کیا جائیں

اس کی محفل میں سنا ہے کہ ابھی قائم ہیں
ٹیڑھے تیور، کہیں دزدیدہ نظر، کیا جائیں

کس کو فرصت ہے جو جاوید کے غم دیکھے گا
ساتھ لے کر تجھے اے دیدہ تر کیاجائیں



(نذرِ میرؔ)

مرے خوابوں میں کب نہیں آتا
جو حقیقت میں اب نہیں آتا

مجھ کو بھی اپنے حال پر رونا
پہلے آتا تھا اب نہیں آتا

لوگ آتے تھے بے غرض ملنے
اب کوئی بے سبب نہیں آتا

دفن ہے ایک راز سینے میں
کچھ کہوں تا بہ لب نہیں آتا

اپنی مرضی سے آتا رہتا ہے
جب بلاتا ہوں تب نہیں آتا



شعلوں کی تمازت سے جو اب بھاگ رہے ہیں
سنتے ہیں وہی لوگ کبھی آگ رہے ہیں

''ڈش'' چین سے اب رات میں سونے نہیں دیتا
آرام کا ہے وقت مگر جاگ رہے ہیں

مکار نے ہر حال میں سیدھے کئے الّو
کوئل کے سہارے پہ سدا کاگ رہے ہیں

کیا یاد نہیں ہے کہ کبھی ہم بھی تمہارے
ہونٹوں پہ مچلتا ہوا اک راگ رہے ہیں

اس درجہ گریبان ہوا چاک ہمارا
مدت سے اسے بیٹھے ہوئے تاگ رہے ہیں

جاوید سہارے کی ضرورت ہے انھیں بھی
اک عمر ستوں گھر کے جو بے لاگ رہے ہیں



کیا خبر تھی وہ بھی دن آ جائیں گے
آئینے خود میری چغلی کھائیں گے

آج مشکل ہے ہمارا بولنا
دیکھنا ہم ایک دن فرمائیں گے

آدمی سے بچ کے رہنا چاہیئے
کاٹ لیں گے پہلے، پھر غرائیں گے

کر رہے ہیں اعتبار زندگی
دیکھنا اک روز دھوکا کھائیں گے

مل نہ پائے تو بھی جی لیں گے مگر
مل گئے تو جیتے جی مر جائیں گے

کچھ بچا کے رکھ لے اپنے درد و غم
ایک دن تیرے بڑے کام آئیں گے



ہم تو مکر و دغا نہیں کرتے
آپ کرتے ہیں یا نہیں کرتے

اپنی اپنی تو سب سناتے ہیں
بس ہماری سنا نہیں کرتے

وقت پر کام آ گئے ورنہ
کھوٹے سکے چلا نہیں کرتے

تم چھپا لو نقاب میں چہرہ
ہم کتابیں پڑھا نہیں کرتے

کچھ تو ہے نفی ہو کہ ہو اثبات
بے سبب سر ہلا نہیں کرتے

گڑگڑاتے ہیں بس ترے آگے
سب کے در پہ صدا نہیں کرتے

زہر آلود تھی ہوا ورنہ
سبز پتے گرا نہیں کرتے



(نذرغالب)

وہ چلمن سے اپنی تو کم دیکھتے ہیں
وہی جن کو حسرت سے ہم دیکھتے ہیں

سبھی دیکھتے ہیں ہنسی ان کے لب پر
اور ہم ان کی آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

ستم جتنا کرنا تھا وہ کر چکے ہیں
ہے کیا ان کا اگلا قدم دیکھتے ہیں

نہیں جانتا کوئی اندر سے اس کو
سبھی اس کا جاہ و حشم دیکھتے ہیں

ہمیں دیکھتی ہے حقارت سے دنیا
محبت سے دنیا کو ہم دیکھتے ہیں



شیطان سے بھی دوڑ میں آگے ہے آدمی
اب آدمی کو دیکھ کے بھاگے ہے آدمی

تبدیل ہو چکا ہے شب و روز کا نظام
سوئے ہے دن میں رات کو جاگے ہے آدمی

پہلے جنوں میں چاک گریباں کرے ہے پھر
فرصت میں خود ہی بیٹھ کے تاگے ہے آدمی

یارو یہ بھاگ دوڑ کی دنیا عجیب ہے
انسان پیچھے رہ گیا، آگے ہے آدمی



زرد زرد شاخوں پر پھول کھلنے والے ہیں
آ بھی جا کہ گلشن میں ہر طرف اجالے ہیں

پتھروں کی فطرت تو بدلی ہے نہ بدلے گی
اتنے مطمئن پھر کیوں شیش محلوں والے ہیں

کون کتنا مخلص ہے کس کو کتنی الفت ہے
دشمنوں کو پرکھیں گے دوست دیکھے بھالے ہیں

آبرو سلامت ہے جھک کے چلنے والوں کی
آسماں نظر اپنی ٹوپیاں سنبھالے ہیں

دور دل کے زخموں کو کس طرح کریں جاوید
ہم نے خون دے دے کر مدتوں میں پالے ہیں



حضور آپ کو لوگ کم جانتے ہیں
مگر آپ کیا ہیں یہ ہم جانتے ہیں

ہمیں بھی وہ جانیں ضروری نہیں ہے
یہ کم تو نہیں ان کو ہم جانتے ہیں

یہی جانتے ہیں کہ کچھ بھی نہ جانا
نہ اس سے زیادہ نہ کم جانتے ہیں

کوئی ان کی فطرت سے واقف نہیں ہے
وہی جن کو سب محترم جانتے ہیں

محبت کا انجام اللہ جانے
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں



یہ سچ ہے یاروں کو اپنے دعا نہیں دیتے
مگر حریفوں کو بھی ہم سزا نہیں دیتے

دعائیں دیجئے ان کو جو اس زمانے میں
ہزار غم ہیں مگر بد دعا نہیں دیتے

مرے خدا مجھے کر دے چراغِ راہ گذر
چراغ گھر کے سبھی کو ضیا نہیں دیتے

سجا نہ سوکھے درختوں پہ پھول کاغذ کے
کہ تتلیوں کو خزاں میں دغا نہیں دیتے

تری تلاش میں جاوید میں بھٹکتا ہوں
یہ راستے مجھے تیرا پتہ نہیں دیتے



ڈھول بہت بے شرم ہے بھائی
جانے کس کا چرم ہے بھائی

لہجہ اس کا سخت ہے لیکن
اندر سے وہ نرم ہے بھائی

رام کو یا رحمان کو مانو
اپنا اپنا دھرم ہے بھائی

اس کو ویسا ہی بھرنا ہے
جس کا جیسا کرم ہے بھائی

باہر کتنا سرد ہے موسم
اندر کتنا گرم ہے بھائی

خواجہ جاوید اختر میں بھی
شعر و سخن کا جرم ہے بھائی



مشکل ہے لیکن نکلے گا
بوتل سے بھی جن نکلے گا

تاریکی سے خوف نہ کھاؤ
رات ڈھلے گی دن نکلے گا

اُس کا جیسا ظاہر دیکھا
کیا ویسا باطن نکلے گا

غیروں کی اس بھیڑ میں کوئی
اپنا بھی محسن نکلے گا

تو نکلے گا ساتھ کسی کے
اور کوئی تجھ بن نکلے گا

سورج ڈوب رہا ہے ڈوبے
وہ پھر اگلے دن نکلے گا



کڑی ہے دھوپ کرے کس طرح سفر کوئی
نہیں ہے راہ میں اب دور تک شجر کوئی

میں اپنے شہر میں پھرتا ہوں اجنبی کی طرح
عجب نگاہ سے تکتا ہے مجھ کو ہر کوئی

تمام عمر میں خود اپنے آپ میں گم تھا
تلاش کرتا رہا مجھ کو عمر بھر کوئی

میں ایک راہ گذر کی تلاش میں ہوں مگر
تلاش کرتی ہے مجھ کو بھی رہ گذر کوئی

میں برگزیدہ بزرگوں کی اک نشانی ہوں
مجھے بھی دیکھ لے جی بھر کے اک نظر کوئی

ہماری بستی میں کہنے کو لوگ بستے ہیں
مکان چاروں طرف ہیں، نہیں ہے گھر کوئی



تم اپنی پہچان بچاؤ
جتنا ہو امکان بچاؤ

ہنسنے کے دن پھر آئیں گے
ہونٹوں کی مسکان بچاؤ

میری تو تم بعد میں سوچو
پہلے اپنی جان بچاؤ

میرے پیچھے پڑا ہوا ہے
تم جیسا شیطان، بچاؤ

سر پر کوّے منڈلاتے ہیں
اپنے اپنے کان بچاؤ

ہندوستان بچا لیں گے ہم
تم تو پاکستان بچاؤ



گل کھلایا ہے چٹانوں پہ ہنر میرا ہے
یہ زمیں غیر کی ہے اور شجر میرا ہے

تنگ پڑتی ہے زمیں لاکھ تو پڑنے دیجئے
آسماں دیکھئے تاحد نظر میرا ہے

محو حیرت ہیں مجھے دیکھ کے دشمن میرے
آج بھی باقی مرے شانوں پہ سر میرا ہے

جس کے دم سے ابھی روشن ہے زمانہ سارا
اک دیا اب بھی سرِراہ گذر میرا ہے

میری مرضی کا وہ ہر کام کیا کرتا ہے
اس کے دل پر ابھی اتنا تو اثر میرا ہے



جو مدت سے مرے دل کو کئے برباد بیٹھا ہے
ستم دیکھو مقابل وہ ستم ایجاد بیٹھا ہے

اٹھائے تھے بڑے ارمان سے دیوار و در جس نے
انھیں کے درمیاں اک خانماں برباد بیٹھا ہے

پرندے اس لئے اس پیڑ سے اب دور رہتے ہیں
کہ ان کی گھات میں شاید کوئی صیاد بیٹھا ہے

عمل نا آشنا ہے کس قدر اس دور کا انساں
مگر ہر شخص میں تیشہ بکف فرہاد بیٹھا ہے

میں اپنے شعر پر جاوید خود تنقید کرتا ہوں
کہیں چھپ کر مرے اندر کوئی نقاد بیٹھا ہے



کہہ دیا تو نے مجھے دشمن جانی کیسے
مر گیا آج تری آنکھ کا پانی کیسے

حسنِ درپردہ میں یہ ریشہ دوانی کیسے
تذکرہ پھولوں کا کانٹوں کی زبانی کیسے

وہ توبس اپنی سناتا تھا مگر حیرت ہے
اس نے سن لی ہے مری رام کہانی کیسے

اب بھی بازار میں ملتے ہیں خریدار جمیل
کوئی لائے گا مگر یوسف ثانی کیسے

مدتوں حرف شناسی میں الجھتا ہے کوئی
اوربن جاتی ہے پھر ایک کہانی کیسے

کھینچ کرصفحۂ قرطاس پہ مبہم سے خطوط
لوگ بن جاتے ہیں بہزاد و مانی کیسے



منسوب تھے جو مجھ سے وہ آلام کیا ہوئے
جو وقف ہو چکے تھے مرے نام، کیا ہوئے

نازاں تھے جن پہ گھر وہی احرام کیا ہوئے
دیوار کیا ہوئی وہ در و بام کیا ہوئے

انگلی اٹھا رہا ہے جسے دیکھئے وہی
ہم زندگی کی دوڑ میں ناکام کیا ہوئے

گلیوں میں بھی نکلتے ہوئے ڈر رہے ہیں لوگ
کچھ حادثے سڑک پہ سرِ شام کیا ہوئے

تھا کچھ نہ کچھ ضرور جو گردش میں آ گئے
کس کی نظر لگی تھی مرے جام کیا ہوئے



جہاں طوفان ہوتا ہے نہ کچھ ہیجان ہوتا ہے
وہیں پر ڈوبنے کا خاص کر امکان ہوتا ہے

بہت کچھ فائدے کا آج کل امکان ہوتا ہے
ہمیشہ جھوٹ سے کس نے کہا نقصان ہوتا ہے

نبھانا کس قدر مشکل ہے اب رسم محبت بھی
زباں سے یوں تو کہہ دینا بہت آسان ہوتا ہے

مرے دل کی ہمیشہ ایک سی حالت نہیں رہتی
کبھی آباد رہتا ہے کبھی ویران ہوتا ہے

زمانہ تھا کہ ہم اک دوسرے پر جان دیتے تھے
کہاں کوئی کسی پر آج کل قربان ہوتا ہے



میاں کبھی بھی نہ آدمی ہو گے
تم نہ سدھرے ہو اور نہ سدھرو گے

آخرت میں وہی تو کاٹو گے
بیج جیسا یہاں پہ بوؤ گے

جیتے جی یوں جو چین سے سو گے
اپنے ہاتھوں سے قبر کھودو گے

اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا
ایک دن تم ضرور سوچو گے

کون پڑھتا ہے آج کل چہرہ
تم کہاں تک کتاب بیچو گے

آسماں سر پہ ہے سبق کے لئے
ایک دن تم بھی سرنگوں ہو گے

حشر ساماں بنے ہو تم جاوید
روز محشر جواب کیا دو گے



میں نے روکا بہت پر گئے سب کے سب
جانے پھر کیا ہوا ڈر گئے سب کے سب

دوست کیا اب تو دشمن بھی مفقود ہیں
بات کیا ہے کہاں مر گئے سب کے سب

ہر قدم پر زمانہ مخالف رہا
کام اپنا مگر کر گئے سب کے سب

دن میں سورج کے تھے ہمسفر، دن ڈھلے
لے کے مایوسیاں گھر گئے سب کے سب

پیڑ سوکھے تھے قدرت بھی تھی مہرباں
آج پھل پھول سے بھر گئے سب کے سب

کیا خطا تھی کسی نے بتایا نہیں
مجھ پہ الزام کیوں دھر گئے سب کے سب

آپ تنہا بچے ہیں مری بزم میں
ورنہ جاوید اختر، گئے سب کے سب



قدرت کے نظارے دیکھے
سورج، چاند، ستارے دیکھے

تم کہتے ہو پھول کھلے ہیں
ہم نے تو انگارے دیکھے

رام رحیم کی کھینچا تانی
کھیل جگت کے سارے دیکھے

جھیل کی خاموشی دیکھی پھر
تیز ندی کے دھارے دیکھے

خون ابلتا تھا پانی سا
ایسے بھی فوارے دیکھے

ملت دیکھی صدیوں میں
لمحوں میں بٹوارے دیکھے



اس نے مٹا دیا ہے ہمارا نشان تک
اور آہ بھی نہ آئی ہماری زبان تک

آ کے وہ لوٹ جائے گا میرے مکان تک
اس بات کا تو مجھ کو نہیں تھا گمان تک

شاخوں پہ ایک پھول بچا ہے زہے نصیب
پہنچے نہ یہ خبر بھی ہواؤں کے کان تک

اے دوستو یہ گردش دوراں تو دیکھنا
محفوظ رہ نہ پائی بزرگوں کی شان تک

تحت الثریٰ سے عرش تلک دسترس تھی اب
محدود ہو گئی ہے نظر آسمان تک

کاٹو مری زبان مگر یہ بھی سوچ لو
اک دن نہ مل سکے گا کوئی ترجمان تک



طولِ شبِ فراق کے مارے نہیں گئے
پلکوں کا ساتھ چھوڑ کے تارے نہیں گئے

موجوں نے ایک بار گھروندے گرائے تھے
بچے کبھی ندی کے کنارے نہیں گئے

اتنا اکڑ کے چلتے ہو پھر کیوں زمین پر
تم سیدھے آسماں سے اتارے نہیں گئے

سوچا ترے بغیر گذاریں گے زندگی
دو چار دن بھی ہم سے گذارے نہیں گئے

ہم بھی کسی کی زلف گرہ گیر کی طرح
الجھے ہیں اس قدر کہ سنوارے نہیں گئے



اس کا بخیہ ادھیڑ رکھا ہے
ہم نے اس کو کھدیڑ رکھا ہے

یار ہم نے لگا کے آنگن میں
نیم کا ایک پیڑ رکھا ہے

اپنی رسوائی کے بکھیڑے میں
مجھ کو جبراً گھسیڑ رکھا ہے

اس کے اعمال کی سیاہی نے
اس کا چہرہ لتھیڑ رکھا ہے

کھولتا ہی نہیں ہے دروازہ
اس نے اندر سے بھیڑ رکھا ہے

مل نہ پائیں گے دونوں آپس میں
یوں بنا کر جو میڑ رکھا ہے

ہم نے چھیڑا نہیں کبھی اس کو
اس نے خود مجھ کو چھیڑ رکھا ہے



ہم کو سمجھیں نعل برابر
گھر کی مرغی دال برابر

اک مچھلی بھی ہاتھ نہ آئی
پھینکے ہم نے جال برابر

برسوں رہے ہم جس سے غافل
اس نے پوچھا حال برابر

اس کے ہجر میں تو لگتا ہے
اک لمحہ ہے سال برابر

یاد کیا کرتے ہیں مجھ کو
یارانِ بنگال برابر

مات ہمیں سے کھا جاتا ہے
چلتا تو ہے چال برابر

کوئی شاعر ہوا نہ اب تک
غالبؔ اور اقبالؔ برابر



سائے مجبور ہیں پیڑوں سے اترنے کے لئے
کیوں خزاں کہتی ہے پتوں سے بکھرنے کے لئے

بھر کے مٹھی میں تو لے جائے گی بادل کو ہوا
کوئی شب آئے گی تاروں سے سنورنے کے لئے

اس کو دو پل بھی مرا ساتھ گوارا نہ ہوا
ساتھ میں جس کے میں تیار تھا مرنے کے لئے

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہوا روٹھ گئی
منتظر پھول ہیں باغوں میں بکھرنے کے لئے

کس بہانے سے تجھے دیکھنے آئے جاوید
کوئی رستہ ہو ترے در سے گذرنے کے لئے



ہوا ہے آنکھوں پہ نازل عذاب کچھ دن سے
دکھائی دیتا نہیں کوئی خواب کچھ دن سے

حساب دینا ہے اعمال کا مجھے اک دن
ہیں کشمکش میں گناہ و ثواب کچھ دن سے

کسی بھی طور سے ہٹتی نہیں نظر اپنی
میں پڑھ رہا ہوں اک ایسی کتاب کچھ دن سے

افق سے تا بہ افق کچھ دھواں دھواں سا ہے
نظر نہ آیا کوئی آفتاب کچھ دن سے

نہ جانے کون ہے جاوید جس سے ملنے کو
ہے میرے دل کو بہت اضطراب کچھ دن سے



خشت ہے کوئی نہ سنگ ہے
آئینہ بھی آج دنگ ہے

ٹوٹتے ہی ڈور سانس کی
زندگی کٹی پتنگ ہے

آج کل ہر ایک آدمی
اپنی ذات میں ملنگ ہے

فکر آسماں نظر سہی
کیا کریں زمین تنگ ہے

شکل سے لگے ہے آدمی
فطرتاً مگر نہنگ ہے

زندگی کے بوجھ سے مرا
چور چور انگ انگ ہے



جاوید تجھے اس کی خبر ہے کہ نہیں ہے
رہتا ہے تو جس گھر میں وہ گھر ہے کہ نہیں ہے

دنیا کی نظر اس کی نگاہوں پہ ہے لیکن
اب میری طرف اس کی نظر ہے کہ نہیں ہے

نکلے جو سفر پہ تو یہ ہم نے نہیں دیکھا
رستے میں کہیں کوئی شجر ہے کہ نہیں ہے

تیار بکھرنے کو ہر اک پھول ہے لیکن
گلشن میں ہواؤں کا گذر ہے کہ نہیں ہے

مدّت سے اجالے کو ترستی ہیں نگاہیں
اب رات کے دامن میں سحر ہے کہ نہیں ہے



خواب آنکھوں میں بونا ہے
گہری نیند میں سونا ہے

دن کالا ہے اجلی رات
یہ سب جادو ٹونا ہے

ننھے دیئے سے روشن اب
گھر کا کونا کونا ہے

چھوڑو ماضی کی باتیں
دیکھو کل کیا ہونا ہے

ہر اک کو اس دنیا میں
کچھ پانا کچھ کھونا ہے

اپنے حال پہ اے جاوید
اب جی بھر کے رونا ہے



جب زیادہ جنون دیکھا ہے
اس کی آنکھوں میں خون دیکھا ہے

تو نے شملہ کی جنوری دیکھی
میں نے دلّی کا جون دیکھا ہے

مفلسوں کے غیور چہروں پر
ہم نے اکثر سکون دیکھا ہے

مول بڑھنے لگا ہے پانی کا
کتنا سستا ہے خون، دیکھا ہے

صرف ہم دیکھتے رہے بنیاد
ورنہ سب نے ستون دیکھا ہے

پھر مرے دل کے خشک صحرا نے
یاد کا مان سون دیکھا ہے



اونچا اس کا قد کرتے ہیں
بھائی آپ بھی حد کرتے ہیں

نقّادوں کے جیسے وہ بھی
میری باتیں رد کرتے ہیں

ان کو محاذ جنگ پہ لاؤ
جو سرحد سرحد کرتے ہیں

کام وہی کرتے ہیں وہ بھی
جو سارے برگد کرتے ہیں

جب بھی آئینہ دکھلاؤ
وہ کیسی کھد بد کرتے ہیں

خود غرضوں کا حال یہی ہے
حل اپنا مقصد کرتے ہیں



شفقت کا ایک سایہ تھا جو میرا بخت تھا
اب وہ بھی کٹ گیا جو تناور درخت تھا

وہ خود ہی آج کل ہے پناہوں میں غیر کی
پہلے کبھی جو ملک کا نگران تخت تھا

ہم ان تمام راہوں سے ہنس کر گذر گئے
جن راہوں پر ہمارا ٹھہرنا بھی سخت تھا

بدقسمتی ہماری ہم اس کو نہ پا سکے
وہ بھی نہ پا سکا ہمیں جو نیک بخت تھا

پھل پھول سے بھرا ہے جوجاوید آج کل
کل تک وہ اپنے باغ کا سوکھا درخت تھا



کلی میں پھول میں شمس و قمر میں تاروں میں
تلاش کرتا رہا تجھ کو استعاروں میں

یہ راز عشق نہ کھل جائے اس لئے چپ ہے
وہ بات کرتا ہے مجھ سے مگر اشاروں میں

میں آفتاب ہوں روشن مجھی سے ہے دنیا
یہ روشنی مرے دم سے ہے چاند تاروں میں

خزاں بھی اس گریزاں ہے دوستو جس نے
جلا دیا تھا مرا گھر بھری بہاروں میں

رگڑ رہا ہے زمیں پر وہ ایڑیاں اپنی
شمار ہوتا تھا کل جس کا شہسواروں میں

ہمارے دل پہ ہے قابض جو اک زمانے سے
اسی کا عکس جھلکتا ہے ماہ پاروں میں



کالے پیلے نیلے سانپ
ہیں کتنے زہریلے سانپ

آخر زہر ہی اگلے گا
جتنا دودھ بھی پی لے سانپ

گرم تنفس آہیں سرد
دیکھیں ہیں برفیلے سانپ

ناچ رہا ہے مور ابھی
اور ذرا کچھ جی لے سانپ

نقش ہے وہ بھی لافانی
گیلی مٹی گیلے سانپ

مجھ کو ڈسنے کی خاطر
ڈھونڈ رہا ہے حیلے سانپ



چاہتا ہوں پرندہ سفر میں رہے
اور قوت بھی کچھ بال و پر میں رہے

ٹوٹنا اور بکھرنا الگ بات ہے
کچھ ستارے مسلسل سفر میں رہے

دل میں بس جائیں ایسا مقدر کہاں
کم نہیں ہم کسی کی نظر میں رہے

بے ضرورت گرانے سے کیا فائدہ
کچھ ثمر بھی تو شاخِ شجر میں رہے

موم سا وہ بدن لے کے پھرتا ہے کیوں
عافیت چاہتا ہے تو گھر میں رہے



میٹھی میں الفاظ کرو
پھر لکھنا آغاز کرو

میں اک جینون شاعر ہوں
مجھ کو نظر انداز کرو

خوش رکھنا ہے خوش رکھو
یا مجھ کو ناراض کرو

سننے والا کوئی نہیں
لاکھ یہاں آواز کرو

بعد میں سوچو منزل کی
پہلے سفر آغاز کرو

ناز میں تم پہ کرتا ہوں
تم بھی مجھ پر ناز کرو



گذرنا رہگذاروں سے بڑا آسان تھا پہلے
علاقہ ہم جہاں رہتے ہیں وہ سنسان تھا پہلے

سبب کیا ہے اسے کھونے کا کچھ بھی غم نہیں ہوتا
جسے پانے کا اس دل کو بڑا ارمان تھا پہلے

یہ عالم ہے کہ اب کچھ بھی نہیں اک ہو کا عالم ہے
ہمارے خانۂ دل میں کوئی مہمان تھا پہلے

بشر کا شر نمایاں ہو گیا دور ترقی میں
یہی وہ آدمی ہے جو کبھی انسان تھا پہلے

عجب خوشبو سی آتی ہے در و دیوار سے اب بھی
یہاں کوئی یقیناً صاحب ایمان تھا پہلے

وہ میرے واسطے اب جان دینے پر ہے آمادہ
وہی جاوید جو میرا حریف جان تھا پہلے



دامن کو آنسوؤں سے بھگونا بھی چاہیئے
کھل کر کسی کی یاد میں رونا بھی چاہیئے

اچھا نہیں ہے مفت میں راتوں کا جاگنا
کچھ دیر کے لئے سہی سونا بھی چاہیئے

ہونا نہ چاہیئے ہوا جو کچھ یہاں مگر
جو کچھ ہوا نہیں اسے ہونا بھی چاہیئے

موجوں سے خوب کھیلیئے لیکن کبھی کبھی
ساحل پہ کشتیوں کو ڈبونا بھی چاہیئے



آپ اتنا نہ ہاؤ ہو کیجیے
نرم لہجے میں گفتگو کیجیے

ڈھونڈنے سے خدا بھی ملتا ہے
آپ تھوڑی سی جستجو کیجیے

بات سنئے تو غور سے میری
ذکر پھر جا کے چار سو کیجیے

عشق میں چاک ہو گئے دامن
زندگی بھر انھیں رفو کیجیے

آپ کی عاقبت سنور جائے
کام ایسا کوئی کبھو کیجیے

مجھ کو چلمن سے دیکھئے لیکن
خود کو بھی میرے روبرو کیجیے



بدن اپنا لہو سینے کے باہر پھینک دیتا ہے
کوئی بھی شخص جب نشتر چبھو کر پھینک دیتا ہے

یہی دیکھا ہے کوئی شے اگر بے جان ہوتی ہے
اسے اکثر کنارے پر سمندر پھینک دیتا ہے

سکوں نا آشنا، سیماب فطرت کیا کہیں اس کو
سدا ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دیتا ہے

جسے دل سے لگاتے ہیں مشام جاں بناتے ہیں
اسی خوشبو کو ہر اک پھول ہنس کرپھینک دیتا ہے

فنون آذری حاجت روا جس کو سمجھتی ہے
اسے پتھر سمجھ کر ابن آذر پھینک دیتا ہے



میری آنکھ میں آنسو بھی ہے
لیکن دل پر قابو بھی ہے

آنکھوں میں دیدار کی خواہش
اور ہاتھوں میں چاقو بھی ہے

ہیں خونخوار درندے لیکن
اس جنگل میں آہو بھی ہے

اس کی اور نہ دیکھے کوئی
اس کی آنکھ میں جادو بھی ہے

ڈھونڈ رہے ہو دل پہلو میں
پہلے دیکھو پہلو بھی ہے



جا کر جو کبھی چین کبھی روس رہے ہیں
وہ بھی توغریبوں کا لہو چوس رہے ہیں

جس بات کو محسوس نہ کرتے تھے کبھی ہم
اب آج اسی بات کو محسوس رہے ہیں

اس کو مرے ہر پل کی خبر رہتی ہے شاید
پیچھے مرے ہر گام پہ جاسوس رہے ہیں

فرصت ہوتو جی بھر کے تجھے دیکھ لیں ہم بھی
اک عمر تری دید سے مایوس رہے ہیں

رکھتے تھے ہمیں لوگ صحیفوں میں، کبھی ہم
دنیا کی نظر میں پرِ طاؤس رہے ہیں


Urdu Poetry
And
Ghazals